صلی اللہ علیہ وسلم

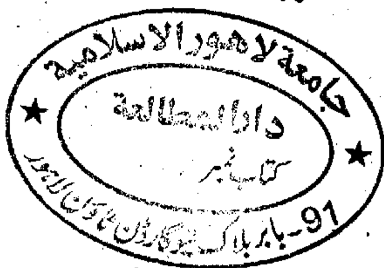
رسولِ خدا کا طریقِ تربیت

مولانا سراج الدین ندوی




بسم اللہ الرحمن الرحیم

رسولِ خدا ﷺ کا طریقِ تربیت



مولانا سراج الدین ندوی

اسلامک پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
۱۳۔ کورٹ سٹریٹ لوئر مال روڈ، لاہور

نام کتاب : رسول خدا ﷺ کا طریق تربیت

مصنف : سراج الدین ندوی

اشاعت : ایڈیشن تعداد

11 2100

مئی 2005ء

اہتمام : پروفیسر محمد امین جاوید (مینجنگ ڈائریکٹر)

اسلامک پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

۱۳۔کورٹ سٹریٹ، لوئر مال لاہور۔ پاکستان

فون : 7248676-7320961۔فیکس 7214974

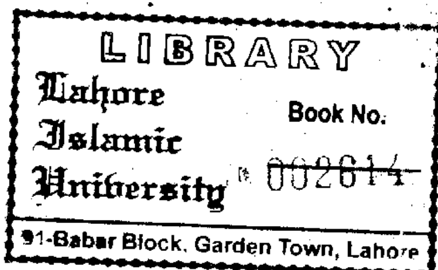
ویب سائٹ : www.islamicpak.com.pk

ای میل : Islamicpak@hotmail.com

Islamicpak@yahoo.com

مطبع : شریف پرنٹرز، لاہور

قیمت : -/45 روپے



فہرست مضامین



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

دنیا میں بے شمار مصلحین پیدا ہوئے۔ بہت سی اصلاحی اور انقلابی تحریکیں اٹھیں مگر ان میں سے ہر ایک نے انسان کے خارجی نظام کو تو بدلنے کی کوشش کی لیکن اس کے اندرون کو نظر انداز کر دیا۔ مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریک میں شامل ہونے والا انسان باہر کے ساتھ ساتھ اندر سے بھی بدل گیا اور کلیۃً بدل گیا۔ جو لوگ آپؐ کی دعوت پر لبیک کہتے گئے وہ آپؐ کی تربیت پا کر کندن بنتے گئے۔ اسلام کی آغوش میں آنے والے ہر شخص کے اندر ایسا کردار نمودار ہوا جس کی نظیر تاریخ انسانی پیش کرنے سے قاصر ہے۔

اس کردار نے کفار کے نرغہ میں کلمۂ حق بلند کیا۔ جاہلیت کے پجاریوں کے درمیان جاہلیت کو چیلنج کیا۔ اس کردار نے مکہ کی وادیوں میں تپتے ریت پر، ابتلاء و آزمائش کی بھٹیوں سے گزرتے ہوئے ''اللّٰہ احد، اللّٰہ احد'' کی صدا بلند کی...... اور دولت و آسائش کو لات مار کر فقر و قناعت کی زندگی کو ترجیح دی۔ نجاشی کے دربار میں جرات و بیباکی اور حق گوئی کی ایک نئی تاریخ مرتب کی۔ اس کردار نے اگر ایک طرف گھر کا تمام اثاثہ خدمت رسالتمآبؐ میں لا حاضر کیا تو دوسری طرف افلاس کی حالت میں دن بھر کی مزدوری میں حاصل ہونے والی کھجوریں راہِ خدا میں دے کر خوشی و مسرت کا سانس لیا۔ اس کیریکٹر نے خود بھوکا رہ کر پکا پکایا کھانا دوسروں کو کھلا کر شکم سیری کا لطف محسوس کیا اور بیوی سے چراغ گل

کرادیا تا کہ مہمان کو یہ احساس بھی نہ ہو کہ میزبان بھوکا ہے۔ اس اُسوہ نے میدان جنگ میں تشنگی کی حالت میں جان جان آفریں کے سپرد کردی مگر یہ گوارہ نہ کیا کہ اپنے پیاسے بھائی سے پہلے پانی کا کٹورہ اپنے تھرتھراتے ہونٹوں سے لگالے۔ راہِ خدا میں جامِ شہادت پی کر اس کردار کی روح جھوم اٹھی اوراس کی زبان سے بے ساختہ نکلا ''فُزْتُ بِرَبِّ الْكَعْبَةِ'' (ربِّ کعبہ کی قسم میں کامیاب ہوگیا) اس کردار نے رات کے اندھیرے میں ماں کے کہنے کے باوجود دودھ میں پانی ملانے سے انکار کردیا۔ اس پختہ سیرت نے جب شراب حرام ہونے کی منادی سنی تو گھروں میں رکھے ہوئے شراب کے مٹکے اور ہونٹوں سے لگے ہوئے پیالے توڑ ڈالے۔ جب جہاد کا اعلان ہوا تو اس کردار نے ایڑیوں کے بل کھڑے ہو ہو کر اپنے آپ کو جہاد میں شریک ہونے کا اہل ثابت کیا۔ اس کردار کا دامن اگر کبھی داغدار ہوا تو اس نے رسولِ خدا کی خدمت میں بار بار آ کر عرض کیا کہ اے اللہ کے رسولؐ مجھے پاک کر دیجئے۔ اس پیکر کو جب گورنری سونپی گئی تو مدائن کے لوگ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اُن کا گورنر قلی کی طرح سر پر گٹھری لادے چلا آرہا ہے تا کہ اس سے اپنا خرچ چلا سکے۔؟

یہ وہ کردار ہیں جن کی عظمت اور درخشانی وتابندگی پر ہر مؤرخ انگشت بدنداں ہے۔
تاریخ کا ادنیٰ طالب علم ہونے کی حیثیت سے عرصہ سے میری یہ تمنا تھی کہ رسولِ خدا کی آغوشِ تربیت میں جو کردار پروان چڑھے ہیں ان کا گہرائی سے مطالعہ اور تجزیہ کیا جائے اور ان نکات واصول کا سراغ لگایا جائے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کردار سازی میں پیش نظر رکھتے تھے تا کہ رسولِ خداؐ کے اصولِ تربیت کی روشنی میں نئی نسل کی اصلاح وتربیت کا عظیم کام انجام دیا جاسکے۔

مجھے اس بات کا شدت سے احساس ہے کہ میں اپنی کم مائیگی کی وجہ سے اس موضوع پر قلم اٹھانے کا استحقاق نہیں رکھتا۔ یہ صرف اللہ کا خصوصی فضل ہے کہ اس نے اپنے رسولؐ کی زندگی کے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی توفیق عطا فرمائی۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ اس حقیر

سی کوشش کو میرے لیے دنیا و آخرت میں باعث خیر و برکت بنائے اور میرا شمار اپنے ان نیک بندوں میں فرمائے جو علامہ اقبالؒ کے اس شعر کا مصداق ہیں۔

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

میں محترم محمد جاوید اقبال صاحب، مولانا عطاء الرحمٰن وجدی صاحب اور جناب عرفان احمد خلیلی صاحب کا مشکور و ممنون ہوں کہ ان کی رہنمائی اور مفید مشورے میرے لیے تقویت کا باعث بنے۔

بار الہا، تیرے رسولؐ کی حیاتِ مبارکہ کے بعض گوشوں پر مشتمل ایک حقیر سی کاوش تیرے حضور حاضر ہے تو اسے قبول فرما اور میرے لیے زادِ آخرت بنا۔ (آمین)

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ.

والسلام!

سراج الدین ندوی

حضرت محمدؐ.... مُربّیِ اعظم

اب سے چودہ سو سال پہلے دنیا اپنے تاریک ترین دور سے گزر رہی تھی۔ کسی خطۂ ارض پر رشد وہدایت کا کوئی نشان باقی نہ رہا تھا۔ پورا عالمِ انسانی ضلالت وگمراہی کے دلدل میں پھنس چکا تھا۔ ہندوستان کے روحانی پیشواؤں کی تعلیمات اپنا اثر زائل کر چکی تھیں اور یہ ملک اوہام وخرافات کا شکار تھا۔ شرک وبت پرستی اپنے عروج پر تھی۔ بقول ایک ہندو مؤرخ ''ہندوستان میں خداؤں کی تعداد یہاں کی آبادی سے بھی زیادہ بڑھ گئی تھی۔ ایک ایک آدمی پر کئی کئی خداؤں کا اوسط پڑتا تھا۔''[1] بعض فرقوں میں اعضائے تناسل کی پرستش ہوتی تھی۔ مذہب کے علمبردار اور مندر کے پجاری بداخلاقیوں کے پیکر بنے ہوئے تھے۔ ذات پات، چھوت چھات نے انسانوں کو کئی خانوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ اچھوت کی حیثیت غلام بلکہ جانور سے بھی کم تھی۔ وہ اگر اونچی ذات والے کو چھو لیتا تو گردن زدنی قرار پاتا۔ جبکہ اونچی ذات والے کے لیے کسی بھی طرح کی کوئی سزا نہ تھی! پورا ہندوستانی معاشرہ بگاڑ کی انتہا پر پہنچ چکا تھا۔ عورتوں کے جامۂ عصمت کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ ایک عورت کے کئی کئی شوہر ہو سکتے تھے۔ شوہر کی موت کے بعد عورت اپنے شوہر کی چتا پر جل کر ستی کی مقدس رسم ادا کرتی گویا کہ ہر بدی، نیکی اور ہر ثواب گناہ کا لبادہ اوڑھ چکا تھا۔

مصر وشام، بابل ونینوا اور یونان وچین میں تہذیب وتمدن کی شمعیں گل ہو چکی تھیں۔ وہاں لاقانونیت وانارکی کا دور دورہ تھا۔ بے شرمی وبے حیائی کا بازار گرم تھا۔ ظلم وجور، قتل وغارت گری ان کی زندگی کا معمول بن چکا تھا۔ سفاکی ورہزنی کو کمال اور ہنر کی حیثیت حاصل تھی۔

---

[1] تاریخ اسلام از شاہ معین الدین ندوی۔ مطبوعہ دار المصنفین۔ اعظم گڑھ

روم وایران اس وقت سب سے زیادہ منظم ریاستیں تھیں لیکن ان کی تہذیب اپنی چمک دمک کھو چکی تھی۔ اب ان کی تہذیب کے ملبہ سے تعفن اٹھ رہا تھا۔ دونوں ریاستوں میں بدترین مظالم کا دور دورہ تھا۔ حکومت کے سامنے کوئی ضابطۂ اخلاق نہ تھا۔ رعایا بادشاہوں کی غلام تھی اور بادشاہ خواہشات کے غلام تھے شاہی خاندان کی پرواز عیاشی اور ہوس پرستی سے آگے نہ تھی۔ مذہبی پیشواؤں کی خانقاہیں عیش ونشاط کے مرکز بن گئی تھیں۔ آئے دن کی خانہ جنگیوں، روزمرہ کے سیاسی انقلابات نے انسانی زندگی کو اجیرن بنا رکھا تھا۔ طوائف الملوکی نے کشت وخون کے بازار گرم کر رکھے تھے۔ رعایا ٹیکسوں کی بھرمار، رشوتوں کی زیادتی سے جاں بلب تھی۔ ان مایوس کن خوفناک فضاؤں میں کوئی صدائے، احتجاج بھی بلند نہیں کر سکتا تھا۔

ایران میں زردشت اور مانی کی اخلاقی تعلیمات صرف اہرمینیت ویزدانیت کا گورکھ دھندہ بن کر رہ گئی تھیں۔ امن وآشتی کی دعویدار عیسائیت روم میں سفاکی ودرندگی اور تعیش وہوس پرستی کی آماجگاہ بن گئی تھی۔ یہاں تک کہ بنی اسرائیل جوان حالات میں لوگوں کے لیے امید کی کرن ثابت ہو سکتے تھے، خود کبر وانانیت کے پندار میں محبوس تھے۔ اپنے اغراض کے لیے الہامی کتاب میں تحریف اس کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ اخلاق واعمال کے مقابلہ میں لفظی موشگافیوں کو اہمیت حاصل تھی۔ طمع ولالچ ان کی فطرت بن گئی تھی۔ رشوت وسود خوری اور اس کے نتیجے میں شقاوت وسنگدلی کوئی معیوب شے نہ تھی۔ ان کا پورا اخلاقی اور سماجی ڈھانچہ ریزہ ریزہ ہو چکا تھا۔

عرب کا حال تو اور برا تھا۔ وہاں دحشت ودرندگی کا راج تھا۔ نام ونمود، عدن ویمن کی عظمت کے کھنڈرات کے سوا وہاں تہذیب وتمدن کا کوئی نشان نہ تھا۔ انسانیت قبائلی خانوں میں تقسیم تھی۔ آئے دن کے جنگ وجدل نے سکون وطمانیت کو غارت کر کے رکھ دیا تھا۔ انسانی جان کی کوئی قیمت نہ تھی۔ معمولی معمولی بات پر لڑائی کی آگ بھڑک اٹھتی اور سالہا

سال تک جاری رہتی۔ کبھی لڑائی کا سلسلہ ۴۰ سال تک چلتا رہتا۔ عورت کی عزت وعفت کی بھی کوئی حیثیت نہ رہی تھی۔ وہ بازاروں میں نیلام ہوتی۔ بدکاری وزناکاری کوئی معیوب شے نہ سمجھی جاتی۔ لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی زندہ درگور کر دیا جاتا، ازدواج کی کوئی حد نہ تھی۔ بھیڑ بکری کی طرح آدمی جتنی عورتیں رکھنا چاہتا بلا روک ٹوک رکھ لیتا۔ شراب تو عربوں کی گھٹی میں پڑی تھی۔ کوئی بزم اس وقت تک بارونق اور کوئی دعوت اس وقت تک مکمل نہ سمجھی جاتی جب تک اس میں شراب کے جام نہ چلیں۔ ہر گھر میکدہ تھا اور ہر فرد ساقی بھی اور میخوار بھی۔ جوا اور سٹہ بازی ان کے لیے فخر ومباہات کی چیزیں تھیں، سودی خوری بھی یہودیوں کے فیض سے رائج تھی۔ مالدار افراد اور گھرانے سود کا کاروبار کرتے تھے۔ بعض قبیلوں نے چوری اور ڈاکہ زنی کو مستقل پیشہ بنا رکھا تھا۔ پورا سماج اوہام وخرافات کی تاریکیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ خدا کے ساتھ شرک ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ خانہ خدا میں بھی تین سو ساٹھ بت نصب تھے۔ ہر قبیلہ کا بت الگ تھا۔ سب سے بڑا بت ہبل کعبہ کی چھت پر نصب تھا۔ ان بتوں کی پرستش ارکان حج میں داخل تھی۔ ان بتوں کو راضی رکھنے کے لیے انسانوں کی بلی دی جاتی۔ ان کے نام سانڈ چھوڑے جاتے۔ ان کے نام سے فال نکالی جاتی۔ شرک کے علاوہ بعض قبیلوں میں عیسائیت رائج تھی۔ کچھ قبیلوں میں یہودیت کا غلبہ تھا۔ بعض افراد مجوسی تھے۔ کچھ لوگ ستاروں کی پرستش کرتے، اس پر مستزاد ان کے دل ودماغ میں عجیب وغریب قسم کے عقائد راسخ ہو گئے تھے۔ مثلاً وہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں مانتے اور جنوں کو الوہیت کا درجہ دیتے تھے! گویا کہ عرب فکری لحاظ سے دیوالیہ ہو چکا تھا اور عملی اعتبار سے خواہش پرستی کی نچلی سطح پر پہنچ کر جانوروں کی سی زندگی بسر کر رہا تھا۔

ان حالات میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم شرف نبوت سے نوازے جاتے ہیں۔ آپ غار حرا سے واپس آکر اپنی دعوت کا آغاز کرتے ہیں۔ لوگوں کو خدا کی طرف بلاتے ہیں۔ اپنے رسول ہونے کا اعلان کرتے ہیں اور اخروی زندگی کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔

آپ ؐ کا قافلہ بڑھنا شروع ہوتا ہے۔ کچھ لوگ آپ کی دعوت کے مخالف ہو جاتے ہیں۔ وہ آپ کے پیغام، آپ ؐ کی دعوت کو ناکام بنانے اور آخر میں آپ ؐ کے وجود کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کے لیے تمام تدابیر، ہر طرح کی سازشیں، مختلف ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں مگر ان کی کوششیں رائیگاں جاتی ہیں۔ کاروانِ اسلام آپ ؐ کی رہنمائی میں آگے بڑھتا ہے..... اور ۲۳ سال کی قلیل مدت میں دنیا کی سب سے بڑی طاقت بن کر ابھرتا ہے اور پھر چند سالوں میں دنیا کے بڑے حصہ پر چھا جاتا ہے۔

پھر یہ کاروانِ رسالت دنیا کی ساری برائیوں سے پاک اور تمام خوبیوں سے مرصّع زندگی کے ہر شعبہ میں ایسی مثال قائم کرتا ہے کہ مؤرخ جب تاریخ کے اس مرحلہ پر پہنچتا ہے تو انگشت بدنداں رہ جاتا ہے کہ دنیا کی سب سے پسماندہ اور جاہل قوم تہذیب وتمدن کی شمع روشن کرتی ہے اور تمام انسانوں کے لیے کارزارِ حیات میں مشعل بن جاتی ہے۔ اس کاروانِ محمدی ؐ میں جو لوگ شامل ہوتے ہیں ان کی یکسر کایا پلٹ جاتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دائرۂ اسلام میں داخل ہونے اور آنحضور ؐ کی تربیت حاصل کرنے کے بعد گویا ایک بالکل نیا آدمی نمودار ہوتا ہے..... بداخلاقیوں کا مجرم سیرت واخلاق کا پیکر بن جاتا ہے۔ انسانوں کا قاتل انسانیت کا نگہبان بن جاتا ہے۔ رذالت ودنائت کی دلدل میں پھنسا ہوا انسان شرف وغیرت کی بلندیوں کو چھو لیتا ہے۔ اَن پڑھ اور کند ذہن انسان کے اندر اعلیٰ صلاحیتوں کے چشمے پھوٹ پڑتے ہیں۔ جنگجو صلح وآشتی کا علمبردار بن جاتا ہے، زانی وبدکار عفت وحیا کا مجسمہ نظر آتا ہے۔

پھر یہ انقلاب انسان کے کسی ایک پہلو میں نمایاں نہیں ہوتا بلکہ زندگی کے تمام شعبوں میں رونما ہوتا ہے۔ عقائد وافکار میں ایک خوش گوار تبدیلی آتی ہے۔ اس کے سوچنے کے دھارے بدلتے ہیں۔ پسند وناپسند کے معیار تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اس کے مشاغل ودلچسپیاں نیا رنگ اختیار کرتی ہیں۔ اس کے ضمیر وروح میں ایک نیا احساس انگڑائی لینے لگتا ہے۔

عبادات کے طور طریقے تو بالکل ہی بدل جاتے ہیں۔ بتوں کو سجدہ کرنے اور ہر در پر جھکنے والا سر اب صرف خدا کے سامنے جھکتا ہے۔ خدا اور رسولؐ کی اطاعت ان کی زندگی کا محور و مرکز بن جاتی ہے۔ دعوتِ دین کے لیے ان کے مال، اوقات، صلاحیتیں سب کچھ وقف ہو جاتی ہیں!

معیشت کے اصول و مبادی بالکل بدل جاتے ہیں۔ سود خوری کے بجائے اب نفاق وایثار ان کا شیوہ ہو جاتا ہے، جعل سازی ودھوکہ دہی کے بجائے صدق وامانت ان کا سلوگن قرار پاتا ہے۔

معاشرتی زندگی میں ایک نیا انقلاب بپا ہوتا ہے۔ فساد و بگاڑ کی جگہ رشد و ہدایت کے سوتے پھوٹنے لگتے ہیں، چوری وڈکیتی کے بجائے عطاء و بخشش کا بازار گرم ہوتا ہے۔ شراب وقمار کی نشستوں کے بجائے اصلاحی ورفاہی کاموں کی پلاننگ ہوتی ہے۔ اپنے حقوق لینے کی فکر کے بجائے دوسرے کے حقوق کی ادائیگی کی تڑپ پیدا ہو جاتی ہے۔

رسولؐ خدا کے ذریعہ یہ نئی خوشگوار اور مکمل تبدیلی یقیناً توحید، رسالت، آخرت کے تصورات کے ذہنوں میں جاگزیں ہونے کے نتیجہ میں وجود میں آئی۔ خدائی الوہیت اور حاکمیت کا تصور اس کے سامنے اپنی تمام زندگی کی جوابدہی کا احساس اس عظیم انقلاب کا باعث بنا۔ مگر سوال یہ ہے کہ ان حقائق کو ذہنوں میں جاگزیں کرانے اور انسان کے اندر ایسا عظیم انقلاب بپا کرنے اور اس کو مستحکم و پائیدار بنانے کے لیے خدا کے رسولؐ نے نہ جانے کتنے حکیمانہ اصولوں کو اختیار کیا ہوگا۔ آیئے آپ کے چند حکیمانہ اصولِ تربیت کا مطالعہ کریں تاکہ ہم بھی تعلیم وتربیت کے سلسلہ میں ان کو اپنے سامنے رکھ سکیں۔

حکمت و دانائی

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دعوتی اور تربیتی طریقوں میں دانائی اور حکمت کو پیش نظر رکھتے تھے۔آپ کوئی ایسا لفظ زبان سے نہ نکالتے اور نہ کوئی ایسی روش اختیار فرماتے جس سے مخاطب کوئی غلط تاثر قبول کرلے،اس کے اندر بےاطمینانی کی کیفیت پیدا ہو یا وہ کسی ردعمل کا شکار ہو جائے۔آنحضورؐ کی پوری دعوتی اور تربیتی زندگی حکمت سے بھری ہوئی ہے۔آپؐ کے حکیمانہ اصولوں اور طریقوں کو تربیت دینے کے لیے الگ سے ایک ضخیم تالیف کی ضرورت ہے۔ یہاں پر صرف چند نمایاں اور اہم پہلوؤں کی جانب اشارہ پر اکتفا کیا جارہا ہے۔

نبی کریمؐ اس بات کا بھرپور خیال رکھتے کہ اگر کسی کی کوتاہی علم میں آجائے تو اس کو اس انداز سے نہ ٹوکا جائے کہ اسے برا محسوس ہو یا اس کے جذبات کو ٹھیس لگے۔چنانچہ آپؐ اس کے لیے کسی مناسب موقع کا انتظار کرتے۔انفرادی طور پر متنبہ کرنے کے بجائے کسی مجمع کو خطاب کرتے ہوئے آپؐ اس کی کوتاہی کی طرف اشارہ فرمادیتے۔غلطی کرنے والے کو احساس ہوجاتا اور وہ اس کو ترک کردیتا اور اسے یہ بھی محسوس نہ ہوپاتا کہ یہ بات خاص طور سے مجھ ہی سے کہی جارہی ہے۔گویا کہ براہِ راست سمجھانے کے بجائے اجتماعی طور پر سمجھانے کا طریقہ اختیار فرماتے۔

ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا کہ کچھ لوگوں نے آپؐ کی بتائی ہوئی عبادات کو کم سمجھ کر غلو اختیار کرنے کا تہیہ کرلیا ہے...... کسی نے کہا کہ میں کبھی گوشت نہیں کھاؤں گا۔کسی نے عزم کیا کہ میں کبھی شادی نہیں کروں گا۔کسی نے کہا میں بستر پر نہیں سوؤں گا۔جب آپ کے علم میں یہ بات آئی تو آپؐ نے ان سے براہ راست گفتگو کرنے کے بجائے لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

مَا بَالُ اَقْوَامٍ یَقُوْلُ اَحَدُھُمْ کَذَا وَکَذَا وَلٰکِنِّیْ اَصُوْمُ وَاُفْطِرُ وَاَنَامُ وَاَقُوْمُ وَآکُلُ اللَّحْمَ وَاَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ (متفق علیہ)

''کیا بات ہے کہ کچھ لوگ ایسی ایسی باتیں کرتے ہیں حالانکہ میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں۔ سوتا بھی ہوں اور نماز کے لیے کھڑا بھی ہوتا ہوں، گوشت بھی کھاتا ہوں اور شادیاں بھی کرتا ہوں۔ پس جو شخص میری سنت کو پسند نہیں کرتا وہ مجھ سے نہیں۔''

جب کچھ لوگوں کی غیر اسلامی روش اور غیر اسلامی طرزِ فکر رسولؐ خدا کے علم میں آئیں تو آپؐ نے اجتماعی طور پر خطاب کرتے ہوئے اس غلط طرزِ فکر کی اصلاح فرمادی۔ اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ عام حضرات کے سامنے بھی اسلام کا صحیح طرزِ فکر آ گیا۔ لوگوں کو غلو پسندی کے بجائے اعتدال کی راہ معلوم ہوگئی۔

اگر کبھی اس کی ضرورت محسوس فرماتے کہ غلطی پر براہِ راست متنبہ کر دیا جائے تو تنہائی میں نہایت دل سوزی اور محبت کے انداز میں سمجھاتے تاکہ مخاطب کسی احساس کمتری کا شکار بھی نہ ہو، اور وہ اپنی اصلاح بھی کر لے۔ ایک بار ابن ابوسلمہؓ اپنے بچپن میں آپ کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے۔ ان کا ہاتھ پلیٹ میں کبھی ادھر پڑتا، کبھی اُدھر کیوں کہ وہاں دوسرے لوگ موجود نہیں تھے اور بروقت ٹوکنا بھی زیادہ بہتر تھا۔ اس لیے آپؐ نے فی الفور ابن ابوسلمہؓ کو متنبہ کیا مگر منفی انداز میں نہیں بلکہ نہایت پیار بھرے لب ولہجہ اور مثبت انداز میں فرمایا۔ مزید یہ کہ آپؐ نے صرف اسی کوتاہی پر نہیں ٹوکا۔ بلکہ کھانے کے بنیادی آداب بیان فرمائے کہ ابن ابوسلمہؓ کو یہ بھی محسوس نہ ہوا کہ آپؐ میری غلطی پر مجھے ٹوک رہے ہیں بلکہ وہ یہ سمجھے کہ مجھے کھانے کے آداب بتا رہے ہیں۔ اس لیے آپؐ نے پہلے دوسرے آداب بتائے اور آخر میں یہ ادب بیان فرمایا کہ پلیٹ میں اپنی طرف سے کھانا چاہیے۔

آپؐ نے فرمایا:

یَا غُلَامُ سَمِّ اللّٰہَ وَکُلْ بِیَمِیْنِکَ وَکُلْ مِمَّا یَلِیْکَ. (بخاری ومسلم)

"اے بچہ (جب کھانا کھاؤ تو سب سے پہلے) اللہ کا نام لیا کرو۔ داہنے ہاتھ سے کھایا کرو اور اپنی طرف سے کھایا کرو۔"

دیکھئے آنحضورؐ کس پیار بھرے انداز میں اپنی گفتگو شروع فرما رہے ہیں۔ غلطی پہ مثبت انداز میں متنبہ کرنے سے پہلے ذہن کو مختلف ہدایات سے اس طرح آمادہ و تیار کر رہے ہیں کہ آخری بات بھی دوسری ہدایتوں کی طرح ایک ہدایت ہے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا کہ آنحضورؐ کسی غلطی کی طرف توجہ مبذول کرانے کے لیے زبان سے کچھ نہ کہتے بلکہ اشارہ فرما دیتے اور غلطی کرنے والے کو اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا بعض موقعوں پر یہ اشارہ زبانی ہدایت سے زیادہ مؤثر اور نصیحت آموز ہوتا۔ ایک بار حضرت فضلؓ سواری پر آنحضورؐ کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک عورت آئی۔ حضرت فضلؓ اس عورت کی طرف دیکھنے لگے اور وہ عورت حضرت فضلؓ کو دیکھنے لگی۔ آنحضورؐ نے اپنے ہاتھ سے حضرت فضلؓ کا چہرہ دوسری طرف کر دیا۔ (بخاری)

اس موقع پر زبان سے کوئی بات کہنا مصلحت وحکمت کے خلاف تھا۔ کس انداز سے بات کہی جائے؟ دونوں میں سے کس کو مخاطب بنایا جائے؟ کن الفاظ کا استعمال کیا جائے؟ اگر نہایت احتیاط کے ساتھ الفاظ استعمال کیے جائیں تب بھی جذبۂ خودداری کو ٹھیس لگنے کا اندیشہ تھا۔ اس کے لیے اللہ کے رسولؐ نے نہایت حکیمانہ طریقہ اختیار فرمایا۔ بہت آہستہ سے حضرت فضلؓ کے سر پر ہاتھ رکھا اور ان کا رخ دوسری جانب کو کر دیا۔ سمجھنے والا رسولؐ اللہ کے اشارہ کو سمجھ گیا۔ یقیناً حضرت فضلؓ کو اپنی کوتاہی کا احساس بھی ہوا ہوگا اور آنحضورؐ کے حکیمانہ طریق توجہ کا اچھا اثر بھی پڑا ہوگا۔

دعوت وتربیت کے سلسلہ میں آپ کی ایک خاص حکمت یہ بھی رہی ہے کہ زیادہ لمبی بات، اکتا دینے والے وعظ سے گریز فرماتے۔ مختصر سے مختصر الفاظ میں اپنے مدعا کو بیان کرنے کی کوشش کرتے تاکہ سننے والے کے ذہن میں بات اچھی طرح بیٹھ جائے اور اگر آدمی ازبر کرنا چاہے تو آسانی سے ازبر کر سکے۔ چنانچہ احادیث میں بہت سے آپ کے

جملے ایسے ملتے ہیں۔ جو الفاظ کے اعتبار سے بہت مختصر ہیں۔ مگر ان میں معانی کا ایک سمندر پنہاں ہے۔ اصطلاح میں اس طرح کے کلمات کو "جوامع الکلم" کہا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ہم چند "جوامع الکلم" یہاں نقل کرتے ہیں، تاکہ آپ اندازہ لگا سکیں کہ نپی تلی بات کو کس کس انداز سے کہنا چاہیے۔

خَيْرُ الْاُمُوْرِ عَوَازِمُهَا شَرُّ الْعَمِي عَمَى الْقَلْبِ.

"بہترین معاملہ وہ ہے جس کا عزم کر لیا گیا ہو۔ سب سے برا اندھا پن دل کا اندھا پن ہے۔"

خَيْرُ الْعِلْمِ مَانَفَعَ اَلْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِّنَ الْيَدِ السُّفْلٰى.

"بہترین علم وہ ہے جو نفع بخش ہو۔ اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔"

شَرُّ النَّدَامَةِ يَوْمُ الْقِيَامَةِ.

"قیامت کے روز لاحق ہونے والی پشیمانی سب سے بڑی پشیمانی ہوگی۔"

مَاقَلَّ وَكَفٰى خَيْرٌ مِمَّا كَثُرَ وَاَلْهٰى.

"کم اگر کافی ہے تو اس زیادہ سے بہتر ہے جو غافل کر دے۔"

اَحْسَنُ الْهَدْيِ هَدْيُ الْاَنْبِيَاءِ — بہترین سیرت انبیاء کی سیرت ہے۔

خَيْرُ الْغِنٰى غِنَى النَّفْسِ. — بہترین مالداری دل کی مالداری ہے۔

كُلُّ مَا هُوَ آتٍ قَرِيْبٌ — ہر آنے والی چیز قریب ہے۔

اَلشَّبَابُ شُعْبَةٌ مِنَ الْجُنُوْنِ. (البیہقی) — نوجوانی پاگل پن کا ایک دور ہے۔

یہ چند جوامع الکلم ہیں جن سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آنحضورؐ نے مختصر الفاظ میں بے پناہ معانی کو سمو دیا ہے۔ آپؐ کے مواعظ و نصائح بہت مختصر ہوتے تھے۔ آپ کے بارے میں احادیث میں آتا ہے۔

کم اگر کافی ہے تو اس زیادہ سے بہتر ہے جو غافل کر دے۔"

اِنَّهٗ اِذَا خَطَبَ لَايُخِلُّ وَلَا يُمِلُّ. (ابوداؤد) — آپؐ جب خطبہ دیتے تو اس میں کوئی نقص نہ ہوتا اور نہ ہی آپؐ (لوگوں کو) اکتاتے (لمبی بات کہہ کر)

حضرت جابر بن سمرہؓ آپؐ کے بارے میں بیان کرتے ہیں :

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُطِيْلُ الْمَوْعِظَةَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ إِنَّمَا هِيَ كَلِمَاتٌ يَسِيْرَاتٌ ۔ (ابوداؤد)	رسول اللہؐ جمعہ کے روز لمبی نصیحت نہیں کرتے بلکہ تھوڑی سی باتیں کہتے تھے ۔

ہر وقت نصیحت کرتے رہنا اُکتاہٹ اور کبھی کبھی ردِ عمل کا باعث بن جاتا ہے۔ اس لیے اس بات کا خیال رکھا جائے کہ مخاطب جتنی باتوں کو ہضم کر سکتا ہے۔ اتنی ہی باتوں کی طرف اُسے توجہ دلائی جائے۔ روزانہ یا بار بار ٹوکنے یا نصیحت کرنے سے فائدہ کے بغیر نقصان ہوتا ہے۔ چنانچہ احادیث میں آنحضورؐ کے بارے میں وضاحت کے ساتھ آتا ہے کہ آپ ناغہ کر کے وعظ و نصیحت فرمایا کرتے تھے تاکہ لوگ اُکتا نہ جائیں۔

آپؐ کی حکمت و دانائی کا ایک پہلو یہ ہے کہ اگر آپؐ محسوس کرتے کہ زبانی بات زیادہ مؤثر یا مفید ثابت نہیں ہو سکتی یا سوال کرنے والے کا ذہن پوری طرح مطمئن نہیں ہو سکتا تو آپ عملی طور پر کر کے دکھاتے ۔

ایک بار نبیؐ نے لوگوں کو نماز پڑھائی۔ آپؐ نے ممبر پر کھڑے ہو کر امامت کی تاکہ لوگ آپؐ کے طریقِ نماز کو واضح طور پر دیکھ سکیں اور پھر آپؐ ہی کی طرح نماز پڑھیں۔ چنانچہ آپؐ نے نماز سے فراغت کے بعد فرمایا۔ "اے لوگو! میں نے ایسا اس لیے کیا ہے تاکہ تم میری پیروی کرو، اور دوسروں کو میری نماز سکھاؤ۔" (بخاری)

ابوداؤد اور نسائی وغیرہ نے حضرت علیؓ کی یہ روایت نقل کی ہے ۔

أَخَذَ رَسُوْلُ اللّٰهِ حَرِيْرًا بِشِمَالِهٖ وَذَهَبًا بِيَمِيْنِهٖ ثُمَّ رَفَعَ بِهِمَا يَدَيْهِ فَقَالَ إِنَّ هٰذَيْنِ حَرَامٌ عَلٰى ذُكُوْرِ أُمَّتِيْ حِلٌّ لِإِنَاثِهِمْ	رسول اللہؐ نے اپنے بائیں ہاتھ میں ریشم لی اور داہنے ہاتھ میں سونا۔ ہاتھوں میں لے کر ان دونوں کو اوپر اٹھایا اور فرمایا۔ یہ دونوں چیزیں میری امت کے مردوں پر حرام ہیں اور عورتوں کے لیے حلال ہیں۔

اس حدیث میں آنحضورؐ نے سونے اور ریشم کی حرمت واضح کرنے کے لیے لوگوں کو ریشم

اور سونا اوپر اٹھا کر دکھایا تاکہ ان کی حرمت کی وضاحت ہو جائے۔ اور لوگوں کے دلوں میں ان سے اجتناب کی اہمیت بیٹھ جائے۔

ابوداؤدؒ اور ابن ماجہؒ وغیرہ نے عمرو بن شعیبؓ کے حوالہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسولِ خدا کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور اس نے سوال کیا۔

كَيْفَ الطُّهُورُ : اے اللہ کے رسولؐ وضو کیسے کیا جائے ؟

رسول اللہؐ اگر وضو کی ترکیب اور طریقہ زبانی بتا دیتے تو سوال کا جواب مکمل ہو جاتا مگر آپؐ نے زبانی بتانے کے بجائے ایک برتن میں پانی منگایا اور پورا وضو کر کے دکھایا تاکہ پوچھنے والا عملی طور پر وضو کے طریقہ اور ترکیب کو دیکھ لے اور اُس کے بھول جانے یا کمی بیشی کر دینے کا کوئی خدشہ باقی نہ رہے۔ چنانچہ آپؐ نے وضو مکمل کر کے فرمایا :

فَمَنْ زَادَ عَنْ هٰذَا اَوْ نَقَصَ فَقَدْ تَعَدّٰى وَظَلَمَ ۔

جس شخص نے اس وضو میں کچھ بڑھایا یا کوئی کمی کی تو اُس نے حد سے تجاوز کیا اور ظلم کیا۔

اگر حکمت و دانائی کا تقاضا ہوتا تو آپؐ بات زور دار لب و لہجہ میں فرماتے۔ کبھی قسم کھا کر اپنی بات کی اہمیت واضح کرتے، کبھی ایسا بھی ہوتا کہ جب کسی بات پر زیادہ زور دینا چاہتے تو بار بار قسم کھاتے !

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ ۔ قِيْلَ مَنْ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ اَلَّذِىْ لَا يَأْمَنُ جَارُهٗ بَوَائِقَهٗ ۔ (بخاری)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خدا کی قسم وہ مومن نہیں، خدا کی قسم وہ مومن نہیں خدا کی قسم وہ مومن نہیں۔ آپ سے دریافت کیا گیا اے اللہ کے رسول کون ؟ آپؐ نے فرمایا وہ شخص جس کا پڑوسی اس کے شر سے محفوظ نہ ہو۔

آپؐ اگر ضرورت محسوس کرتے اور وقت متقاضی ہوتا تو نہایت اثر انگیز انداز میں خطاب فرماتے۔ حضرت عرباض بن ساریہ کا بیان ہے کہ ایک بار رسولؐ اللہ نے ایسا وعظ

فرمایا کہ ہمارے جسم سوز و تپش سے جل اُٹھے۔ آنکھیں بہہ پڑیں اور دل لرز اُٹھا۔ (ترمذی)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا بیان ہے کہ ایک بار آپؐ نے سوز و گداز میں ڈوب کر اس طرح خطاب فرمایا کہ جس ممبر پر آپؐ کھڑے تھے وہ لرزنے لگا۔ ہم نے یہ کہا کہ یہ ممبر اب گر جائے گا۔ (مسلم)

وعظ و نصیحت میں یہ سوز و گداز اُسی وقت پیدا ہوتا ہے جب اپنے مخاطبین سے بے پناہ محبت ہو، ان کی خیر خواہی کا خیال ہو، ان کے لیے داعیانہ تڑپ اور بے چینی ہو، خلوص کے جذبات کار فرما ہوں۔

آپؐ اپنے اصحاب کی تعلیم و تربیت کے لیے جو انداز اور طریق اختیار فرماتے اس میں حکمت و دانائی کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور ہوتا۔

آگے چل کر جو ابواب قائم کیے گئے ہیں وہ بھی دراصل حکمت و دانائی کا مظہر ہیں۔

محبت و دلسوزی

اصلاح وتربیت کے سلسلہ میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم محبت وپیار اور دل سوزی کا لب ولہجہ اپناتے۔ آپؐ کے دل کی گہرائیوں سے نکلنے والی آواز مخاطب کے دل میں اُترتی چلی جاتی۔ آپ کا انداز اس قدر خیر خواہانہ اور اس قدر شیریں ہوتا کہ مخاطب مجال سرتابی نہ کرسکتا اور آپ کی بات کو نہایت خوش دلی سے عملی جامہ پہنانے کے لیے تیار ہو جاتا! ایک بار عمر ابن ابی سلمہؓ آپ کے ساتھ کھانا تناول کر رہے تھے۔ ان کے کھانے کا انداز نہایت بے ڈھنگا تھا، کبھی ہاتھ پلیٹ کے کسی حصہ میں پڑتا اور کبھی کسی حصہ میں۔ آنحضورؐ نے یہ منظر دیکھا تو نہایت دلسوزی کے ساتھ فرمایا: پیارے بچے جب تم کھانا کھاؤ تو پہلے بسم اللہ پڑھ لیا کرو، اپنے داہنے ہاتھ سے کھاؤ اور اپنی طرف سے کھایا کرو۔ (بخاری ومسلم)

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زیر تربیت بچہ کو بے ڈھنگے طریقے سے کھانا کھاتے ہوئے دیکھا تو آپؐ کی پیشانی پر کوئی بل نہیں آیا، آپؐ کی زبان سے کوئی سخت لفظ نہیں نکلا، آپؐ نے کرخت لب ولہجہ اختیار نہیں فرمایا بلکہ کھانے کے آداب ایسے محبت بھرے انداز میں بتائے کہ اس کے بعد نہ صرف عمر بن ابی سلمہؓ نے ان کی پابندی فرمائی بلکہ آپؐ کی پوری اُمت آج تک ان کی پابندی کرتی ہے۔

ایک بار ایک شخص خدمت رسالت مآبؐ میں حاضر ہوکر دست سوال دراز کرتا ہے تو نہ آپؐ کے تیور بدلتے ہیں، نہ نگاہوں میں بے التفاتی کی جھلک نظر آتی ہے، نہ لبوں پر حرفِ شکایت آتا ہے۔ آپؐ چاہتے ہیں کہ دستِ سوال دراز کرنے کی عادتوں کو ختم کیا جائے مگر اس کے لیے خشک، وعظ ونصیحت نہیں فرماتے بلکہ نہایت حکمت و دانائی کا طریقہ اختیار فرماتے ہیں آپؐ سائل سے پوچھتے ہیں کہ کیا تمھارے پاس کوئی چیز ہے؟ سائل عرض کرتا ہے کہ اللہ کے

رسولؐ! میرے پاس صرف ایک کٹورہ اور ایک چادر ہے۔ آپؐ چادر اور کٹورہ منگاتے ہیں اور اسے دو درہموں میں فروخت کر دیتے ہیں۔ یہ دونوں درہم سائل کے ہاتھ پر رکھ کر فرماتے ہیں کہ جاؤ ایک درہم سے اپنے گھر والوں کے لیے کھانا خریدو اور ایک درہم سے کلہاڑی خرید کر لاؤ۔ آپؐ اپنے مبارک ہاتھ سے کلہاڑی میں دستہ لگاتے ہیں اور اس کو سائل کے حوالہ کر کے فرماتے ہیں کہ جاؤ' اس کلہاڑی سے لکڑیاں کاٹا کرو اور ان کو فروخت کر کے اپنے گھر والوں کی ضروریات پوری کیا کرو۔ یہ کام تمھارے لیے دستِ سوال دراز کرنے سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم خطاب کرتے ہوئے، وعظ ونصیحت فرماتے ہوئے نہایت درد وسوز اور خلوص وہمدردی کا لب ولہجہ اختیار فرماتے۔ ایک بار آپؐ نے خاندانِ قریش کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

" قافلے کا دیدبان کبھی بھی اچھے ساتھیوں سے جھوٹ نہیں بولتا۔ خدا کی قسم اگر میں (بالفرض محال) تمام لوگوں سے غلط بات کہنے پر آمادہ ہو بھی جاتا تب بھی تم سے غلط بات نہ کہتا۔ اگر میں (بفرض محال) تمام لوگوں کے ساتھ دھوکہ دہی کرتا بھی تب بھی تمھارے ساتھ دھوکہ دہی نہیں کرتا۔ اس خدا کی قسم جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، میں تمام لوگوں کی جانب اور خاص طور پر تمھاری جانب اللہ کا رسول ہوں۔ خدا کی قسم تمھیں مرنا ہے جس طرح تم سو جاتے ہو اور مرنے کے بعد تم کو جی اٹھنا ہے جیسے کہ تم نیند سے بیدار ہوتے ہو۔ تم سے تمھارے کاموں کا حساب لیا جائے گا، تمھیں بھلائی کا بدلہ بھلائی سے اور بُرائی کا بدلہ بُرائی سے ضرور دیا جائے گا اور یہ بدلہ یا تو ہمیشہ کے لیے جنّت کی شکل میں ہوگا یا ہمیشہ کے لیے جہنّم کی شکل میں۔

دیکھئے مُربّیٔ اعظمؐ کی خیر خواہی ایک ایک جملہ سے ٹپک رہی ہے پھر یہ خطبہ خلوص ویقین کی کیفیت سے معمور ہے۔ کتنے سادہ اندازِ بیان، محبت بھرے لب ولہجہ اور عقلی وجذباتی اپیل کے ساتھ آپؐ نے توحید، رسالت اور آخرت کی حقیقتوں کو دل نشین کیا ہے۔

آپؐ کی یہ محبت وہمدردی محض زبان ہی تک محدود نہ تھی بلکہ آپؐ سراپا محبت تھے لوگوں کے دکھ درد میں بذاتِ خود شریک ہوتے، مصائب میں ان کی دلجوئی کرتے، خوشی کی تقریبات میں شرکت کرکے ان سے اپنی قربت کا اظہار فرماتے۔ ہمیشہ خندہ پیشانی سے ملتے، اظہارِ محبت کے لیے مصافحہ اور معانقہ بھی کرتے، بعض اوقات پیشانی چوم لیتے' محبت آمیز بے تکلفی میں کبھی کبھی احباب کو مختصر ناموں سے پکارتے۔ حضرت عائشہؓ کو کبھی "عائش" کہہ کر پکارتے۔ کبھی حضرت ابوہریرہؓ کو صرف "اباہر" کے نام سے پکارتے۔ محبت و ہمدردی پیدا کرنے والے الفاظ اور جملے استعمال کرتے۔ حضرت انسؓ کو پیار سے "یا ذَاالْاُذُنَیْنِ (دو کانوں والے) کہہ کر خطاب کرتے۔ ایک بار حضرت انسؓ کے بھائی ابوعمیر کا پالا ہوا ممولا مرگیا تو وہ اداس بیٹھے تھے۔ حضورؐ آئے تو محبت بھرے انداز میں کہا: "یا اَبَا عُمَیر! مَا فَعَلَ النُّغَیرُ!" (ابوعمیر تمھارے ممولے کو کیا ہوگیا ہے) اگر کبھی کوئی ناخوشگوار بات سامنے آتی تب بھی اسے محبت و پیار کے الفاظ میں ڈھال کر پیش فرماتے۔ ایک بار عبداللہؓ بن بشیر کی والدہ نے ان کے ہاتھ آنحضورؐ کی خدمت میں ہدیہ کے طور پر کچھ انگور بھیجے۔ حضرت عبداللہؓ راستے میں کھا گئے۔ بعد میں اصل معاملہ کھلا تو آپؐ پیار سے عبداللہ کا کان پکڑ کر کہتے: یَا غُدَر یا غُدَر (او دھوکہ باز، او دھوکہ باز)۔

محبت و مروت کی انتہا یہ تھی کہ مدینہ کی ایک عورت نے جس کی عقل میں کچھ فتور تھا ایک بار آپؐ سے کچھ کہنا چاہا۔ آپؐ نے جاکر اس کی بات سنی اور اس کا کام کرکے دیا۔

(المواہب اللدنیہ)

آپؐ کا سلوک لوگوں کے ساتھ کس قدر محبت آمیز ہوتا تھا اس کا اندازہ حضرت انسؓ کے بیان سے لگایا جاسکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں:-

"میں دس برس تک آنحضورؐ کی خدمت میں رہا مگر آپؐ نے کبھی اُف تک نہ کہی۔ جو کام میں نے جس طرح بھی کر دیا آپؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ یہ کیوں کیا؟ اور اگر کوئی کام نہ کرسکا تو یہ نہیں فرمایا "یہ کیوں نہیں کیا؟" یہی معاملہ آپؐ کا کنیزوں اور خادموں کے ساتھ رہا۔ آپؐ نے ان میں سے کبھی کسی کو نہیں مارا۔"

مسلسل دس سال تک آپؐ کی خدمت میں رہنے والا شخص آپؐ کے سلوکِ محبت پر مہرِ تصدیق ثبت کرتا ہے۔ آپؐ کا ایک لفظ بھی کبھی کسی کے لیے شکایت کا سبب نہ ہوتا۔ آپؐ کی یہ محبت و ہمدردی نہ صرف اپنوں کے لیے تھی بلکہ دشمنوں کے ساتھ بھی محبت کا یہی سلوک تھا۔ آنحضورؐ کے سینہ میں محبت کی دہکتی ہوئی بھٹی کا اگر ہم اندازہ کرنا چاہیں تو اس واقعہ سے کر سکتے ہیں کہ جب اہلِ مکہ جنھوں نے آپؐ کو اور آپؐ کے اصحابؓ کو اذیت دینے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی، حتیٰ کہ آپؐ کو اپنا پیارا وطن بھی چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا اور جواب بھی اپنی ننگی تلواریں لیے کھڑے تھے۔ وہی اہلِ مکہ جب قحط کا شکار ہوتے ہیں تو آپ ان کے لیے غلہ کی رسد جاری کراتے ہیں اور انھیں میں سے غریب لوگوں کے لیے پانچ سو اشرفیاں نقد بھجوا دیتے ہیں جس شہر کے باسیوں نے آپؐ کا معاشی بائیکاٹ کیا تھا۔ آپؐ انھیں کے لیے وسائلِ معاش فراہم کرتے ہیں۔ آپؐ کے جذباتِ محبت کا اندازہ ہم بدر کے واقعہ سے بھی لگا سکتے ہیں جب بدر کے قیدیوں کی کراہیں آپؐ کے گوشِ مبارک تک پہنچیں تو آپؐ کی نیند اڑ گئی، اور آپؐ اس وقت تک نہ سو سکے جب تک ان قیدیوں کے بندھن ڈھیلے کر کے انھیں آرام نہ پہنچا دیا گیا۔

اسی طرح طائف میں آپؐ نے لہولہان ہو کر پتھر پھینکنے والوں کے حق میں کلماتِ خیر کہے اور جب فرشتہ نے آکر عرض کیا کہ اگر آپؐ اشارہ کریں تو ان پہاڑوں کو آپس میں ملا دیا جائے جن کے درمیان طائف واقع ہے اور طائف کی بستی پس کر رہ جائے۔ مگر رحمۃ للعالمینؐ نے فرمایا۔ "اگر یہ لوگ خدا پر ایمان نہیں لائے تو مجھے امید ہے ان کی نسلیں ضرور خدائے واحد پر ایمان لائیں گی۔"

مختصر یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سراپا رحمت اور سراپا محبت تھے۔ آپؐ کا یہی سلوک لوگوں کو آپ کا گرویدہ بناتا اور وہ آپؐ کے ہر حکم پر جان دینے کے لیے تیار رہتے، آپؐ کے اشارہ کو پا کر اسے عملی جامہ پہنانا اپنی سعادت سمجھتے۔ تربیت و اصلاح کے سلسلہ میں محبت و دلسوزی کو بڑا دخل ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ ہمیں سختی و کرختگی کے بجائے محبت و پیار کی صفات سے متصف فرمائے تاکہ ہم اپنے فرائض کو بحسن وخوبی انجام دے سکیں!

مزاج اور نفسیات کا خیال

آپؐ گفتگو، برتاؤ اور ہر چیز میں لوگوں کے مراتب اور اُن کی نفسیات کا پورا خیال رکھتے۔ آپ مردم شناسی میں کمال حاصل تھا۔ ہر شخص کی خوبیوں اور اس کے کمزور پہلوؤں پر آپؐ کی گہری نظر ہوتی۔ ہر شخص کے مزاج اور طبیعت کا گہرا مطالعہ کرتے۔ ہر معاملہ میں اُن کے مزاج اور ساخت کا خیال رکھتے۔ آپؐ نے خود ارشاد فرمایا: اَنْزِلُوا النَّاسَ مَنَازِلَهُمْ "لوگوں کے ساتھ ان کے مرتبہ کے لحاظ سے پیش آؤ"۔ جن لوگوں کی تربیت آپؐ کو مقصود ہوتی آپؐ ان کے حالات و کوائف، ان کی ذہنی و جسمانی طاقت، ان کی فطری صلاحیت اور ان کے مزاج و طبیعت کو ملحوظ رکھتے۔ احادیث کے مطالعہ کے دوران یہ واقعہ آپ نے ضرور پڑھا ہوگا کہ ایک شخص آتا ہے وہ سب سے افضل عمل کے بارے میں پوچھتا ہے تو آپؐ اُسے جواب دیتے ہیں کہ جہاد سب سے افضل عمل ہے۔ ایک دوسرا شخص آتا ہے اور یہی سوال کرتا ہے تو آپ اسے جواب دیتے ہیں کہ "نماز" سب سے افضل عمل ہے۔ تیسرے شخص کو آپ بتاتے ہیں کہ حسنِ اخلاق سب سے بہتر عمل ہے۔ بظاہر آپ کے ان اقوال میں تضاد ہے۔ مگر حقیقت میں یہ جوابات مخاطب کے ذہن اور نفسیات کو سامنے رکھ کر دیئے گئے ہیں۔ ایک شخص جو کہ نماز روزہ کی بڑی پابندی کرتا ہے نوافل کا بھی اہتمام کرتا ہے مگر جہاد سے اس کی طبیعت اِبا کرتی ہے جب وہ افضل عمل کے بارے میں سوال کرتا ہے تو آپؐ اسے جہاد پر آمادہ کرنے کے لیے جہاد کو افضل عمل قرار دیتے ہیں۔ ایک دوسرا شخص آتا ہے جو بہت سی نیکیاں کرتا ہے مگر نماز سے جی چراتا ہے، آپؐ اس سے اچھی طرح واقف ہیں اس لیے اس کے لیے نماز کو سب سے بہتر عمل قرار دیتے ہیں۔

ایک روایت میں آتا ہے کہ ایک شخص نے آنحضورؐ سے جہاد میں شرکت کی اجازت چاہی آپؐ نے دریافت کیا کہ تمہارے والدین میں سے کوئی زندہ ہے؟ اُس نے کہا ہاں! میری بوڑھی ماں زندہ ہیں۔ آپؐ نے فرمایا، جاؤ اپنی ماں کی خدمت کرو، اس کے پاؤں کے نیچے جنت ہے۔

(نسائی)

غور کیجئے! ایک شخص بوڑھی ماں کو چھوڑ کر جہاد میں شرکت کی اجازت طلب کر رہا ہے۔ جبکہ ماں سے فطری محبت کا تقاضہ یہ تھا کہ ماں کی خدمت کے لیے جہاد میں عدم شرکت کی اجازت طلب کی جاتی۔ آنحضورؐ کی نگاہِ دوررس سے یہ کمزوری کب چھپ سکتی تھی آپؐ نے صحابی کی دُکھتی رگ پر انگلی رکھی اور فرمایا: جاؤ اپنی ماں کی خدمت کرو، تمہارے لیے یہی جہاد ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ جہاد بہترین عبادت اور افضل ترین عمل ہے مگر جب انسان ماں کے حقوق کی ادائیگی میں کما حقہٗ دلچسپی نہ لے تو پھر اس کے لیے ماں کی خدمت ہی جہاد کا درجہ رکھتی ہے۔

آیئے! اسی سلسلے میں ایک اور واقعہ پر غور کریں۔ ایک شخص رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرتا ہے کہ اے اللہ کے رسولؐ! میں بہت سے گناہوں کا ارتکاب کرتا ہوں مگر میں اپنے اندر ان کو چھوڑنے کی سکت نہیں پاتا۔ البتہ میں صرف کسی ایک گناہ کو چھوڑ سکتا ہوں۔ آنحضورؐ دریافت فرماتے ہیں کہ کیا تم مجھ سے یہ عہد کرتے ہو کہ کبھی جھوٹ نہیں بولو گے؟ وہ شخص کہتا ہے۔ اے اللہ کے رسولؐ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ کبھی جھوٹ نہیں بولوں گا۔ اس کے بعد وہ شخص یہ کہتے ہوئے چلا جاتا ہے کہ رسولِ خداؐ نے مجھ سے کتنی آسان چیز کا مطالبہ کیا ہے جب رات کی تاریکی بڑھ جاتی ہے تو یہ شخص گناہ کے ارادہ سے گھر سے نکلتا ہے مگر معاً ذہن میں خیال آتا ہے کہ کل کو جب رسولِ خداؐ سے ملاقات ہوگی اور وہ مجھ سے سوال کریں گے تو میں کیا جواب دوں گا۔ اگر سچ بولوں گا تو مجھ پر گناہ کی حد جاری کی جائے گی اور اب میں جھوٹ بول سکتا نہیں۔ کیونکہ جھوٹ نہ بولنے کا عہد کر چکا ہوں۔ اس

شخص کے قدم جب کبھی کسی گناہ کے لیے آگے بڑھتے یہی خیال اُس کے لیے زنجیرِ پا بن جاتا۔ چند دن کے بعد جب رسولِ خدا سے ان کی ملاقات ہوئی۔ تو آپ نے حالات پوچھے۔ بولے۔ اے رسولِ خدا جھوٹ نہ بولنے کے عہد نے تمام گناہ چھڑا دیئے۔

اس واقعہ پر ذرا گہرائی سے غور کیجیے۔ ایک شخص رسولِ خدا کی خدمت میں آکر بہت سے گناہوں کے ارتکاب کا اعتراف کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں ان تمام گناہوں کو نہیں چھوڑ سکتا، صرف کسی ایک گناہ کو چھوڑ سکتا ہوں۔ اگر آنحضورؐ چاہتے تو شراب چھوڑنے کا وعدہ لے لیتے جو کہ اُمّ الخبائث یعنی تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ آپؐ چوری ترک کرنے کا وعدہ لے لیتے، جو خود انسان کی آخرت بھی تباہ کرتی ہے اور دوسروں کو بھی نقصان پہنچاتی ہے۔ مگر آپؐ اس شخص کی نفسیات اور مزاج کا مطالعہ کرتے ہیں اور اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ یہ شخص بہت سے گناہوں کے ارتکاب کی بات مجھ سے کہہ رہا ہے تو یہ بہت راست گو اور سچائی پسند ہے۔ یہ گناہوں میں ملوث ضرور ہے مگر حق بات کہنے کی جرأت و ہمت رکھتا ہے۔ اس صورت حال میں جھوٹ ترک کر دینا مشکل بھی نہیں ہوگا۔ پھر آپؐ کے ذہن میں مستقبل کا پورا خاکہ آجاتا ہے۔ چنانچہ آپ اس سے جھوٹ نہ بولنے کا عہد لے لیتے ہیں۔ آنحضورؐ کا اندازہ صحیح نکلتا ہے، وہ کہتا ہے کہ یہ تو میرے لیے بہت آسان چیز ہے۔ پھر مستقبل کے بارے میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ سوچا تھا وہ صحیح ثابت ہوتا ہے۔

اگر اللہ کے رسولؐ نے نفسیات و مزاج کا لحاظ نہ کیا ہوتا اور کسی دوسرے بڑے گناہ کے ترک کا وعدہ لے لیا ہوتا تو شاید اس کی زندگی میں اتنی جلدی انقلاب نہ آتا۔ اس طرح کے واقعات احادیث و سیر کی کتابوں میں بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ ہر مُربّی کو ان کی روشنی میں اپنے زیرِ تربیت افراد کی نفسیات اور مزاج کو سمجھنا، ان کے حالات و کوائف کا تجزیہ کرنا اور ان کے منازل و مراتب کا خیال رکھنا نہایت ضروری ہے۔ نفسیات کے مطالعہ کو تربیت کے سلسلہ میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔

جذبات واحساسات کا پاس ولحاظ

انسان کے جذبات واحساسات کو تعمیری رُخ دینے ہی کا دوسرا نام تربیت ہے۔ نبی کریمؐ اپنے مخاطبین کے مزاج اور نفسیات کو ملحوظ رکھنے کے ساتھ ان کے جذبات کا بھی پورا پورا خیال رکھتے تھے۔ آپ جذبات کو کبھی غلط رُخ اختیار نہ کرنے دیتے۔ اگر جذبات میں سردمہری ہوتی تو آپؐ حکمت کے ساتھ ان میں حرارت پیدا کرتے۔ اگر آپؐ جذبات میں اشتعال محسوس کرتے تو کوئی ایسی بات زبان سے نہ نکالتے اور نہ عملاً کوئی ایسی روش اختیار کرتے جس سے جذبات بے قابو ہو جائیں۔ جذبات واحساسات کی رعایت کر کے انھیں صحیح اور تعمیری رُخ دیتے۔ آپؐ کی حیاتِ طیبہ میں ایسے کئی مواقع آئے کہ اگر آپؐ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے جذبات واحساسات کو نہ سمجھا ہوتا، ان کی رعایت نہ کی ہوتی، ان کو صحیح اور تعمیری رُخ نہ دیا ہوتا اور بروقت حکیمانہ اقدام کر کے ان پر قابو نہ پایا ہوتا تو تاریخِ اسلامی میں کئی ناپسندیدہ ابواب کا اضافہ ہو گیا ہوتا۔ مگر آپؐ نے جذبات کے امنڈتے سیلاب کو روکنے کے بجائے اس کا رُخ صحیح جانب پھیر دیا۔

غزوۂ حنین میں جو مال فئے ملا اس کو آپؐ نے قبائلِ عرب میں تقسیم کر دیا تاکہ اسلام کے تئیں ان کی دل بستگی کا سامان ہو۔ اس موقع پر انصار کو کوئی عطیہ نہیں دیا اور تمام مال دوسرے قبائل میں تقسیم کر دیا۔ انصار نے جب یہ دیکھا تو بشری تقاضہ کے تحت ان میں شکوک و شبہات پیدا ہوئے اور طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ انھوں نے کہا کہ مصیبت کے وقت تو ہم نے ساتھ دیا اور اب جب مال کی تقسیم کا وقت آیا تو آپؐ نے ہمیں نظر انداز کر کے سارا مال اپنی قوم میں تقسیم کر دیا۔ انصار کے معزز ترین فرد حضرت سعید بن عبادہؓ کے علم میں جب یہ بات آئی تو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ

• اللہ کے رسولؐ! انصار کا قبیلہ مالِ فیٔ کی تقسیم کے سلسلہ میں اس وجہ سے روٹھا ہوا ہے کہ آپؐ نے پورا مال اپنی قوم میں تقسیم کر دیا۔ آپؐ نے قبائل عرب کو بڑے بڑے عطیات عنایت کیے، مگر انصار کے حصّہ میں کچھ بھی نہیں آیا۔"

آپؐ نے پوچھا: "سعید بن عبادہؓ! اس سلسلہ میں تمھاری کیا رائے ہے؟" انھوں نے عرض کیا: "اے رسولِ خداؐ میں بھی انصار کا ایک فرد ہوں۔" آپؐ نے سعید بن عبادہؓ سے کہا کہ "اچھا تمام انصار کو اس احاطہ میں جمع کرو۔ میں ان سے گفتگو کروں گا۔" جب تمام انصار جمع ہو گئے تو رسول اللہؐ تشریف لائے۔ آپؐ نے اللہ کی حمد و ثنا بیان کی اور فرمایا:

"اے انصار کے لوگو! تم کیا چہ میگوئیاں کر رہے ہو؟ تمھیں کون سی بات ناگوار گزری ہے؟ جب میں تمھارے پاس آیا، کیا تم گمراہ نہیں تھے؟ اللہ نے میرے ذریعہ سے تمھیں ہدایت دی۔ کیا تم غریب نہیں تھے؟ اللہ نے میرے ذریعہ تمھیں مال داری عطا کی۔ کیا تم آپس میں ایک دوسرے کے دشمن نہیں تھے؟ اللہ نے تمھارے دلوں کو جوڑ دیا؟"

انصار نے کہا: "اللہ اور اس کے رسولؐ کا بے پناہ فضل و احسان ہے۔" پھر آپؐ نے فرمایا:

"اے انصار کے لوگو! خاموش کیوں ہو؟ میری باتوں کا جواب کیوں نہیں دیتے؟"

انصار نے کہا: "اے اللہ کے رسولؐ! ہم آپؐ کو کیا جواب دیں۔ حقیقت میں اللہ اور اس کے رسول ہی کا فضل و احسان ہے۔"

آپؐ نے فرمایا: "اے انصار کے لوگو! خدا کی قسم تم اگر چاہو تو کہہ سکتے ہو اور تمھاری بات صحیح ہو گی، میں بھی تمھاری تصدیق کروں گا۔ تم کہہ سکتے ہو کہ اے محمدؐ! تم اس حال میں ہمارے پاس آئے کہ تمھیں لوگ جھٹلا چکے تھے، ہم نے تمھاری تصدیق کی۔ تم بے یار و مددگار آئے، ہم نے تمھاری مدد کی۔ تم لوگوں کے دھتکارے ہوئے تھے، ہم نے تمھیں پناہ دی۔ تم نادار تھے، ہم نے تمھاری غم خواری کی۔"

"اے انصار کے لوگو! کیا تم دنیا کی ایک حقیر چیز کے بارے میں مجھ سے ناراض ہو گئے ہو جس کے ذریعہ میں نے کچھ لوگوں کی دلجوئی کی ہے تاکہ وہ اسلام لے آئیں اور تمھیں تمھارے اسلام کے حوالے کر دیا ہے۔"

• اے انصار کے لوگو! کیا تم اس بات پر راضی نہیں ہو کر لوگ بکریاں اور اونٹ لے کر واپس جائیں اور تم اللہ کے رسول ؐ کو لے کر اپنے گھر کو واپس جاؤ؟ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمدؐ کی جان ہے جو چیز تم لے کر واپس جاؤ گے وہ اس سے کہیں زیادہ بہتر ہے جس کو لے کر یہ لوگ واپس جائیں گے۔ اگر ہجرت نہ ہوتی تو میں بھی انصار کا ایک آدمی ہوتا۔ اگر لوگ ایک وادی اور گھاٹی میں چلیں اور انصار دوسری وادی اور گھاٹی میں چلیں تو میں انصار کی گھاٹی اور وادی میں چلوں گا۔"

"انصار میرے قریب ترین ہیں اور دوسرے لوگ ان کے بعد، اے اللہ، انصار پر رحم فرما، ان کے بیٹوں اور بیٹوں کی اولاد پر رحم فرما۔" (زاد المعاد)

راوی کا بیان ہے کہ رسول ؐ کی یہ تقریر سن کر لوگ اس قدر روئے کہ ان کی داڑھیاں تر ہو گئیں اور انھوں نے کہا کہ "ہم رسول ؐ اللہ کی تقسیم سے خوش ہیں۔"

غور کیجیے۔ جذبات نزاکت کے کس رخ پر بہہ رہے تھے۔ اگر اللہ کے رسول ؐ نے جذبات کے علی الرغم تقریر کی ہوتی یا جذبات کو نہ سمجھا ہوتا تو اس کی یہ شدت کیسا رنگ اختیار کرتی۔ مگر اللہ کے رسول ؐ نے جب سعید بن عبادہؓ کی زبانی انصار کے جذبات کو سنا تو آپؐ کو غصہ نہیں آیا۔ آپؐ نے زبان سے کوئی ایسی بات نہیں فرمائی جو سعید بن عبادہؓ اور انصار کے جذبات کو ناخوش گوار ردِعمل تک پہنچا سکتی تھی۔ آپؐ نے پوری طرح سے انصار کے جذبات کی شدت کو محسوس کیا۔ آپؐ جانتے تھے کہ بشری تقاضے کے تحت جذبات کی یہ ایک وقتی لہر ہے جس کو نہایت حکمت سے صحیح رخ دینا ضروری ہے۔ چنانچہ آپؐ نے انصار کو سمجھانے کے لیے ان سے براہِ راست گفتگو کا فیصلہ کیا!

جب انصار جمع ہو گئے تو آپؐ تشریف لائے۔ آپؐ نے پہلے انصار کے جذبات کو نارمل کرنے کے لیے ان کا ماضی یاد دلایا، اور بتایا کہ خدا اور رسولِ خدا کے ذریعہ انھیں کتنی عظیم نعمتیں حاصل ہوئی ہیں۔ اس یاد دہانی سے انصار کے جذبات نارمل تو ہو گئے مگر سوالیہ نشان اپنی جگہ باقی رہا اور ابھی ایک رخ تشنہ تھا۔ آپؐ کی تقریر کے جواب میں اگرچہ انصار خاموش ہو گئے تھے۔ مگر ان کے دل و دماغ کے کسی گوشہ میں یہ سوال اٹھ سکتا تھا کہ اگر رسولِ خدا نے

ن سے نکالا ہے تو ہم نے بھی انہیں ایسے عالم میں پناہ دی ہے جب ان کو خود ان کی قوم اپنے وطن سے نکال چکی تھی۔ چنانچہ آنحضورؐ نے اس ابھرنے والے سوال کو خود پوری قوت گویائی کے ساتھ اس طرح بیان کیا کہ انصار کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے ان کے جذبات کو تحلیل کر دیا پھر انصار سے اپنے گہرے تعلق کو پرزور الفاظ میں واضح فرمایا اور ان کے دل نہ صرف یہ کہ شکوک وشبہات سے پاک ہوگئے بلکہ محبت میں اور زیادہ اضافہ ہوگیا۔

آپ جانتے ہیں کہ صلح حدیبیہ اشارۂ خداوندی کی بنیاد پر بظاہر نہایت دب کر کی گئی تھی۔ اس کا اندازہ آپ صلح نامہ کی اس شرط سے لگا سکتے ہیں کہ اگر مکہ کا کوئی شخص اسلام قبول کر کے مدینہ پہنچ جائے گا تو مدینے کے مسلمان اسے مکہ واپس کرنے کے پابند ہوں گے۔ لیکن اگر مدینہ کا کوئی مسلمان مکہ آجائے گا تو اُسے واپس نہیں کیا جائے گا۔ اس طرح کی بہت سی ناقابل فہم شرائط تھیں۔ ابھی شرائط اچھی طرح طے بھی نہ ہونے پائی تھیں اور عہدنامہ لکھا بھی نہ گیا تھا کہ ابو جندلؓ بیڑیوں میں جکڑے ہوئے آئے اور اپنے کو مسلمانوں کے درمیان ڈال دیا اور بتایا کہ میں نے اسلام قبول کر لیا تو مکہ والوں نے مجھ پر مظالم ڈھائے۔ اب ان سے نجات پاکر بھاگا چلا آرہا ہوں۔ قریش کے نمائندوں نے کہا کہ یہ صلح اسی وقت ہوسکتی ہے جبکہ ابوجندلؓ کو ہمارے حوالہ کر دیا جائے۔ اللہ کے رسولؐ نے فرمایا کہ ابھی تو معاہدہ لکھا بھی نہیں گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اگر آپؐ ان کو واپس نہیں کریں گے تو آئندہ آپؐ سے کوئی معاہدہ نہیں کیا جائے گا۔ معاہدہ کی تکمیل کی خاطر (جس میں بہت سے مصالح پوشیدہ تھے) رسولِ خدا نے حضرت ابوجندلؓ کو ان کے حوالہ کر دیا۔ ابو جندلؓ بیڑیوں میں جکڑے کہہ رہے تھے: " اے مسلمانو! میں تمھاری موجودگی میں مشرکین کی طرف واپس بھیجا جارہا ہوں۔ کیا تم میری حالتِ زار نہیں دیکھ رہے ہو کہ مجھے راہِ خدا میں کتنا ستایا گیا ہے "

اس موقع پر صحابہ کرامؓ کے جذبات کیا رہے ہوں گے؟ خاص طور پر نوجوانوں کے جذبات۔ اس کا اندازہ حضرت عمرؓ کی سرگرمیوں سے ہوتا ہے جب وہ رسولِ خدا اور حضرت ابوبکرؓ کے پاس جاکر عرض کرتے ہیں کہ یہ صلح اس قدر دب کر کیوں کی جارہی ہے؟ کیا حضرت محمدؐ رسولِ برحق نہیں ہیں؟ کیا ہمارا دین حق نہیں ہے؟ کیا کفار

برسرِ باطل نہیں ہیں؟ اس عالم میں رسولِ خدا اس معاہدہ کی تکمیل فرماتے ہیں تکمیل سے فراغت کے بعد کھڑے ہوتے ہیں اور صحابہؓ کو مخاطب کرکے ارشاد فرماتے ہیں:

"اٹھو! اپنے جانوروں کو یہیں قربان کر دو۔ پھر اپنے سروں کو منڈا ڈالو۔"

انصار و مہاجرین سکتہ میں تھے۔ وہ مدینہ سے اس عزم اور تیاری سے چلے تھے کہ ایک طویل وقفہ کے بعد خانہ کعبہ کی زیارت کریں گے۔ منیٰ میں جاکر قربانی کریں گے۔ انھیں کفار نے بغیرِ اسلحہ بھی مکہ میں جانے کی اجازت نہ دی اور دوسری طرف غیر مساویانہ شرائط پہ معاہدہ تکمیل کو پہنچا۔ حالانکہ یہ صحابہؓ اب اپنے کو مجبور نہیں پاتے تھے۔ یہ بے سروسامانی کے عالم میں غزوۂ بدر و احزاب میں کامیابی حاصل کیے ہوئے تھے مگر جب اللہ کے رسولؐ نے صلح نامہ پر دستخط کیے تو سب خاموش ہو گئے۔ لیکن جذبات کا یہ خاموش سمندر دلوں سے اُبلا چاہتا تھا۔ تمام صحابہؓ تفکر و تحیر کے سمندر میں غرق تھے۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہ آرہا تھا۔

جذبات کی شدت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ رسولِ خدا کے اشارے پہ جان دینے والے اصحاب اپنے رسول کا حکم پاکر خاموش بیٹھے رہے۔

اللہ کے رسولؐ نے وقفہ وقفہ سے تین بار حکم دیا کہ اٹھ کر اپنے جانوروں کو قربان کر دو، اور اپنے سر منڈا ڈالو۔ مگر کوئی بھی شخص نہ ہلا، گویا کہ سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔

اللہ کے رسولؐ کو جذبات کی شدت کا اندازہ ہے اس لیے خاموش ہو جاتے ہیں۔ آپؐ جانتے ہیں کہ اس موقع پہ اگر کوئی سخت بات کہی گئی تو کسی ناخوشگوار واقعہ پر منتج ہو سکتی ہے۔ ذہن میں کوئی حل نہیں آرہا ہے۔ اپنے حرم میں داخل ہوتے ہیں۔ حضرت اُم سلمہؓ سے پوری روداد سُناتے ہیں۔ باہم مشورے سے ایک بات طے کرتے ہیں۔ حضرت اُم سلمہؓ کے پاس سے واپس آتے ہیں۔ کسی سے کچھ نہیں کہتے، اپنے جانور کی قربانی کرتے ہیں۔ اپنے حجام کو بلاتے ہیں اور اپنا سر منڈاتے ہیں۔ صحابہ کرامؓ آپؐ کو دیکھتے ہیں اور آپ کی تقلید میں اپنے

جانوروں کو قربان کر دیتے ہیں۔ پھر ایک دوسرے کے سر مونڈنا شروع کر دیتے ہیں۔ غم وغصہ کا یہ عالم ہے کہ سر مونڈتے ہوئے ایک دوسرے کو زخمی کیے دیتے ہیں۔ (بخاری)

جذبات کے امڈتے ہوئے اس سیلاب پر آپؐ نے کس طرح قابو پایا یہ ہر معلم و مربی کے لیے قابلِ غور ہے اور قابلِ تقلید بھی!

مناسب مواقع تلاش کرنا اور اُن سے فائدہ اُٹھانا

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہؓ کی تربیت کے لیے بہتر مواقع کی تلاش میں رہتے۔ آپؐ کو جب بھی کوئی موقع ملتا' آپؐ اس کو ضائع نہ ہونے دیتے بلکہ اس سے پورا فائدہ اٹھاتے۔

ایک بار رسولِ خدا کے پاس کچھ قیدی آئے۔ قیدیوں میں ایک عورت بھی تھی جس کے پستانوں سے دودھ ٹپک رہا تھا۔ اُسے قیدیوں میں ایک بچہ نظر آیا۔ اس نے شدتِ جذبات اور فرطِ محبت میں اس بچہ کو گود میں اٹھالیا۔ اُسے اپنے پیٹ سے چمٹالیا اور اپنا دودھ پلایا آنحضورؐ اور صحابہؓ کرام اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ آنحضورؐ نے محسوس کیا کہ اس عورت کے جذبۂ محبت سے صحابہؓ بہت متاثر ہیں۔ آپؐ نے اس تاثراتی کیفیت سے فائدہ اُٹھاکر صحابہ کرام کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا: "اگر اس عورت کو اختیار دے دیا جائے تو کیا یہ اپنے بچے کو آگ میں ڈال سکتی ہے؟" صحابہ کرامؓ نے جواب دیا:—— "خدا کی قسم یہ عورت ایسا نہیں کرسکتی" اس پر آنحضورؐ نے فرمایا: "یہ عورت اپنے بچے پر جتنی مہربان ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر اس سے کہیں زیادہ مہربان ہے۔"

(بخاری و مسلم)

دیکھا آپ نے؟ جب اللہ کے رسولؐ نے محبت سے فضا کو رقت آمیز دیکھا تو اللہ کی محبت' رحم و کرم کو صحابہؓ کے ذہنوں میں جاگزیں کرنے کے لیے آپؐ نے اس موقع سے کس طرح فائدہ اٹھایا۔ اور سوال و جواب کے انداز میں اس حقیقت کو اس طرح ذہن نشین کیا کہ یہ منظر لوگ تا دمِ آخر نہ بھول پائے ہوں گے۔ بلکہ ہر ملاقاتی اور شناسا سے اس واقعہ کو بیان کرکے اللہ کے رحم و کرم کی بے پناہی کا تذکرہ کرتے رہے ہوں گے۔

آئیے اس سلسلہ میں ایک دوسرے واقعہ پر غور کرتے چلیں۔

صحیح مسلم میں حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک گاؤں سے واپسی پر مدینہ کے بازار سے گزر رہے تھے۔ لوگوں نے آپ کو دونوں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ وہاں چھوٹے کانوں والا ایک مردہ بکری کا بچہ پڑا ہوا تھا۔ آپؐ نے اس کے کان پکڑے اور فرمایا۔ "تم میں سے کون اس مردہ بچہ کو ایک درہم میں خریدنے کے لیے تیار ہے؟" صحابہؓ نے فرمایا۔ "ہم کسی بھی قیمت پر اس کو خریدنا نہیں چاہتے ہیں۔ یہ ہمارے کسی کام کا نہیں!" آپؐ نے فرمایا۔ "کیا تم پسند کرتے ہو کہ یہ تم کو مل جائے۔" صحابہؓ نے عرض کیا۔ "اے اللہ کے رسولؐ! اگر یہ زندہ ہوتا تب بھی کان چھوٹے ہونے کا عیب اس میں تھا۔ اور اب تو یہ مردہ ہے۔ اس لیے کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" یہ سن کر نبی کریمؐ نے فرمایا۔ "خدا کی قسم! یہ بچہ تمھاری نظر میں جتنا بے وقعت ہے، دنیا اللہ کی نظر میں اس سے زیادہ بے وقعت ہے۔" (مسلم)

اللہ کے رسولؐ صحابہ کے ساتھ مدینہ میں داخل ہوتے ہیں۔ ایک بکری کا بچہ مرا ہوا پڑا ہے۔ ایسے مقام سے آدمی بہت تیزی سے گذر جاتا ہے۔ غالباً صحابہؓ کرام بھی اس گھناؤنے منظر سے بہت تیزی سے گذرنا چاہتے تھے۔ آنحضرتؐ نے صحابہؓ کے ان جذبات کو محسوس کرلیا۔ آپ نے اس کیفیت سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور دنیا کی بے وقعتی کو اس انداز سے صحابہؓ کے ذہنوں میں بٹھایا کہ پھر دنیا کی ظاہری جگمگاہٹ ان کی نظروں کو کبھی بھی اپنی طرف نہ پھیر سکی۔

ایک مربی کی یہ بڑی ذمہ داری ہے کہ وہ کسی بھی مناسب موقع پر نہ چوکے۔ والدین اپنے بچوں، اساتذہ اپنے شاگردوں، امیر اپنے مامورین کی تربیت کے لیے موقع کی تلاش میں رہے۔ اگر کوئی بات ذہن نشین کرانے کے لیے ذرا سا بھی بہانہ مل جائے تو اس سے بھرپور فائدہ اٹھایئے۔

بخاری و مسلم کی روایت ہے کہ ایک بار ایک شخص آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اس نے عرض کیا:

مَتَی السَّاعَۃُ یَارَسُوْلَ اللہِ؟ اے اللہ کے رسولؐ! قیامت کب آئے گی؟

بظاہر یہ ایک سادہ سا سوال ہے جو کسی کے ذہن میں بھی اٹھ سکتا ہے اور سادہ انداز میں آپؐ کو اس کا جواب دے کر بات کو ختم کر دینا چاہیے تھا۔ مثلاً آپؐ قیامت کی کچھ علامتیں

اور نشانیاں بتا کر پوچھنے والے کو خاموش کر دیتے یا آپؐ یہ کہہ کر خاموش ہو جاتے کہ مجھے اس کا علم نہیں یا یہ جواب دے دیتے کہ اللہ ہی کو اس کا علم ہے وغیرہ مگر آپؐ نے جب یہ دیکھا کہ ایک شخص پر قیامت کی فکر طاری ہے، اور اس کے وقوع کے وقت کے بارے میں سوال کر رہا ہے تو آپؐ نے جواب دینے کے بجائے خود سوال کیا:

مَا ذَا اَعْدَدْتَ لَهَا ؟ — تو نے اس کے لیے کیا تیاری کی ہے ؟

اس سوال کے ذریعہ آپؐ نے اس کی سوچ کے انداز کو ایک مثبت اور صحیح رُخ دیا اور یہ بات اس کے ذہن نشین کرائی کہ اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ قیامت کب آئے گی، اصل مسئلہ یہ ہے کہ قیامت کے لیے ہم نے کیا تیاری کی ہے؟ اگر قیامت دیر سے بھی آئے مگر کوئی تیاری نہ کی جائے تو بے کار ہے۔ اور اگر تیاری کی گئی ہے تو قیامت چاہے ابھی آجائے! آپؐ کے اس سوال نے پوچھنے والے کو احتسابی کیفیت میں مبتلا کر دیا۔ اس نے اپنی پوری زندگی کا جائزہ لیا۔ اس نے خوب سوچا اور جواب دیا:

حُبُّ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ۔ — اس کے لیے میں اللہ اور اُس کے رسولؐ سے محبت کرتا ہوں۔

یعنی آخرت کے لیے میں نے جو زادِ راہ تیار کیا ہے وہ خدا اور رسولِ خدا سے محبت ہے۔ میں زندگی کے ہر معاملہ میں ان دونوں کو راضی رکھنا چاہتا ہوں۔ میری زندگی کا مقصد اور میری سرگرمیوں کا محور خدا اور رسولِ خدا کی رضا کا حصول ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہر وقت اپنے خدا اور اپنے رسولؐ کو راضی رکھوں۔ آپؐ نے جواب میں یہ جملہ سُنا تو فرحت و خوشی سے فرمایا:

اَنْتَ مَعَ مَنْ اَحْبَبْتَ — تم نے جس سے محبت کی تم اسی کے ساتھ رہو گے!

اگر تم خدا اور رسولؐ سے محبت کرتے ہو تو خدا و رسولؐ کا قرب بھی تم کو حاصل ہوگا اور کل میدانِ حشر میں تم کو رسولِ خدا کی معیت حاصل ہوگی۔

ذخیرۂ احادیث میں سے صرف یہ چند مثالیں پیش کی گئی ہیں تاکہ اندازہ لگایا جا سکے کہ اللہ کے رسولؐ ہر موقع سے کس طرح فائدہ اٹھا کر اپنے اصحاب کے ذہن و فکر کی تعمیر کرتے تھے اور ان کی صلاحیتوں کو پروان چڑھاتے تھے!

زجر و توبیخ

جب ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقِ تربیت کا مطالعہ کرتے ہیں تو سیرت پاک میں ایسی بہت سی مثالیں سامنے آتی ہیں کہ آپؐ نے وقتِ ضرورت تیور بدل کر بھی بات کی اور زجر و توبیخ سے بھی کام لیا۔ اصلاح و تربیت کی خاطر آپؐ نے ترکِ تعلق بھی کیا اور اس کا حکم بھی دیا اور اس سلسلہ میں یہ اصول متعین فرما دیا:

اَوْثَقُ عُرَى الْاِيْمَانِ۔ اَلْمُوَالَاتُ فِي اللّٰهِ وَالْمُعَادَاةُ فِي اللّٰهِ وَالْحُبُّ فِي اللّٰهِ وَالْبُغْضُ فِي اللّٰهِ (الطبرانی)	ایمان کا مضبوط ترین رشتہ یہ ہے کہ اللہ کے لیے دوستی کی جائے، اللہ ہی کے لیے دشمنی کی جائے، اللہ ہی کی خاطر محبت ہو، اور اللہ ہی کی خاطر ناراضگی ہو۔

اگر ضرورت متقاضی ہو تو اصلاح و تربیت کے لیے زجر و توبیخ اور ترکِ تعلق بھی ایمان کی علامت اور اسلام کا منشا ہے!

نبی کریمؐ حتی الامکان ملاطفت، نرمی، محبت و دل سوزی، پیار و ہمدردی کے جذبات سے سرشار ہو کر نصیحت فرماتے۔ مگر جب حالات سختی اختیار کرنے کا تقاضا کرتے تو آپ سختی سے بھی کام لیتے۔ کبھی چہرے کے تیور بدل لیتے، کبھی آواز کو بلند فرما لیتے، کبھی سخت لب و لہجہ اختیار فرماتے، کبھی ترکِ کلام اور ترکِ تعلق اختیار کر لیتے، اور جب معاملہ حدود و تعزیرات کا آتا تو بلا کسی رو رعایت کے اسلامی حدود و تعزیرات بھی نافذ فرماتے۔ چنانچہ حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے اپنی ذات کے لیے کبھی کسی سے کوئی انتقام نہیں لیا ہاں، مگر حدود اللہ کی پامالی پر ــــ اگر اللہ کے حدود کو پامال کیا جاتا تو آپؐ سب سے زیادہ غضب ناک ہو جاتے۔

مَا رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنْتَقَمَ لِنَفْسِهِ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا إِذَا انْتُهِكَتْ لِلّٰهِ حُرْمَةٌ فَإِذَا انْتُهِكَتْ لِلّٰهِ حُرْمَةٌ كَانَ أَشَدَّ النَّاسِ غَضَبًا۔ (الطبرانی)

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی اپنے نفس کے لیے کوئی انتقام لیتے نہیں دیکھا مگر یہ کہ اللہ کے کسی حق کی پامالی کی جاتی۔ جب اللہ کے کسی حق کی پامالی کی جاتی تو آپ لوگوں میں سب سے زیادہ غضب ناک ہوتے۔

ایک بار ایک حد کے نفاذ کے سلسلہ میں کچھ لوگ آپ کے پاس آئے اور یہ خواہش ظاہر کی کہ اس حد کو نافذ نہ کیا جائے۔ جب آپؐ نے یہ سنا تو آپ پر غصہ کے آثار طاری ہو گئے اور آپ نے نہایت زوردار لہجہ میں فرمایا:

إِنَّمَا أَهْلَكَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ أَنَّهُ إِذَا سَرَقَ فِيْهِمُ الشَّرِيْفُ تَرَكُوْهُ وَإِذَا سَرَقَ فِيْهِمُ الضَّعِيْفُ أَقَامُوْا عَلَيْهِ الْحَدَّ وَأَيْمُ اللّٰهِ لَوْ أَنَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ مُحَمَّدٍ سَرَقَتْ لَقَطَعْتُ يَدَهَا (متفق علیہ)

تم سے پہلے لوگ اس لیے ہلاک کر دیے گئے کہ جب ان میں سے کوئی بڑا آدمی چوری کرتا تو وہ اس کو چھوڑ دیتے اور جب کوئی کمزور آدمی چوری کرتا تو اس پر حد جاری کرتے۔ خدا کی قسم اگر فاطمہ بنت محمد بھی چوری کرتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹتا۔

یہ صحیح ہے کہ غصہ عام حالات میں ایک مذموم فعل ہے۔ خود قرآن و حدیث میں غصہ کی مذمت کی گئی ہے اور غصہ پی جانے کو نیکی قرار دیا گیا ہے مگر بعض حالات میں مربی و معلم کے لیے اظہار غصہ و ناراضگی ناگزیر ہو جاتا ہے اور ایک دانا و حکیم شخص کا اصل امتحان اسی میں ہے کہ وہ صبر و تحمل کی جگہ غصہ نہ کرے اور جہاں اظہار ناراضگی ضروری ہو وہاں غصہ کو نظر انداز نہ کرے۔

ترمذی نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت نقل کی ہے کہ ایک بار ہم تقدیر کے مسئلہ پر جھگڑ رہے تھے۔ آنحضورؐ جھگڑے کو سن کر باہر تشریف لائے۔ آپؐ ہم پر اتنا ناراض ہوئے کہ آپؐ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے انار کے دانے آپؐ کے رخساروں پر نچوڑ دیئے گئے ہوں۔ پھر آپؐ نے فرمایا: "کیا تم کو اسی کا حکم دیا گیا ہے؟ کیا میں اسی کی خاطر بھیجا گیا ہوں؟ تم سے پہلے لوگ بھی جب اس معاملہ میں لڑے تو ہلاکت سے نہ بچ سکے"۔

آپؐ نے بچوں کی تربیت کے سلسلہ میں بھی مارنے کا حکم دیا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ وقت ضرورت آپؐ سخت تنبیہ کو بھی ضروری سمجھتے تھے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا:۔

مُرُوْا اَوْلَادَکُمْ بِالصَّلٰوۃِ وَھُمْ اَبْنَاءُ سَبْعِ سِنِیْنَ وَاضْرِبُوْھُمْ عَلَیْھَا وَھُمْ اَبْنَاءُ عَشْرٍ وَفَرِّقُوْا بَیْنَھُمْ فِی الْمَضَاجِعِ۔ (ابوداؤد، حاکم)

اپنے بچوں کو نماز کا حکم دو جبکہ وہ سات سال کے ہو جائیں اور جب وہ دس سال کے ہو جائیں اور نماز نہ پڑھیں تو انھیں مارو۔ اور ان کے بستر الگ کر دو۔

مگر یہ بات ہمیشہ ملحوظ رہنا چاہیئے کہ شدت وسختی اور زجر و توبیخ اسی وقت اختیار کی جائے جبکہ محبت و پیار سے سمجھانے بجھانے کے تمام طریقے اختیار کیے جا چکے ہوں ورنہ غلط اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔

وقت ضرورت آنحضورؐ زجر و توبیخ سے بھی کام لیتے۔ ایک بار حضرت ابوذر غفاریؓ نے ایک شخص کو اس کی ماں کے بارے میں طعنہ دے دیا۔ آپؐ نے سخت لب ولہجہ میں ابوذر غفاریؓ کو مخاطب کر کے فرمایا:

اَعَیَّرْتَہٗ بِاُمِّہٖ اِنَّکَ امْرُؤٌ فِیْکَ جَاھِلِیَّۃٌ۔ اِخْوَانُکُمْ خَوَلُکُمْ جَعَلَھُمُ اللہُ تَحْتَ اَیْدِیْکُمْ فَمَنْ کَانَ اَخُوْہُ تَحْتَ یَدِہٖ فَلْیُطْعِمْہُ مِمَّا یَاْکُلُ وَلْیُلْبِسْہُ مِمَّا یَلْبَسُ وَلَا تُکَلِّفُوْھُمْ مِنَ الْعَمَلِ مَالَا یُطِیْقُوْنَ وَاِنْ کَلَّفْتُمُوْھُمْ فَاَعِیْنُوْھُمْ

(البخاری)

کیا تو نے اس شخص کو ماں کے بارے میں عار دے دیا ہے؟ (اے ابوذر) تمھارے اندر ابھی جاہلیت باقی ہے! یہ تمھارے بھائی ہیں جن کا اللہ نے تمھیں مالک بنا لیا ہے جس کا بھائی اس کے دست نگر ہو اس کو چاہیئے کہ اپنے کھانے میں سے اس کو کھلائے اور جو پہنے وہی اس کو پہنائے۔ ان پر ایسے کام کا بار نہ ڈالو جس کو وہ کر نہ سکتے ہوں، اور اگر تم ان پر کوئی ایسا بار ڈالو تو ان کی مدد کرو۔

ایک بار بعض ازواج مطہرات نے نان ونفقہ کے سلسلہ میں دلخراش روش اپنائی تو

آپؐ نے ان کی اصلاح کے لیے تقریباً ایک مہینہ تک ان سے ترکِ تعلق اختیار فرمایا۔ وحی نازل ہونے کے بعد آپؐ نے انھیں اختیار دیا کہ اگر وہ اس حالت میں نکاح میں رہنا پسند کریں تو ٹھیک ہے ورنہ بہتر طور پر رخصت ہو جائیں۔ اس وقت چار ازواج آپؐ کے نکاح میں تھیں سب نے بخوشی آپؐ کے نکاح میں رہنا پسند فرمایا۔

آنحضورؐ نے عورت کی اصلاح و تربیت کے سلسلہ میں جہاں مارنے کی اجازت دی ہے وہیں پر یہ ہدایت بھی فرمائی کہ اگر عورت تنبیہ کرنے سے بھی باز نہ آئے تو ان سے اپنے بستر الگ کر لو۔

حضرت کعبؓ بن مالک، ہلالؓ بن امیہ، مرارہؓ بن ربیع جب کسی عذرِ شرعی کے بغیر غزوۂ تبوک میں شریک نہ ہو سکے تو آنحضورؐ نے جس طرح سخت نوٹس لیا وہ تاریخ اسلام کا ایک اہم واقعہ ہے اور اصلاح و تربیت کرنے والوں کے لیے ایک نمونۂ عمل! اس واقعہ کو کعبؓ بن مالک کی زبانی سنیئے اور غور کیجیے کہ نبی کریمؐ اصلاح و تربیت کی خاطر کبھی کبھی کتنا سخت نوٹس لیتے تھے۔

حضرت کعبؓ بن مالک فرماتے ہیں:

"غزوۂ تبوک کی تیاری کے زمانے میں نبیؐ جب کبھی مسلمانوں سے شرکتِ جنگ کی اپیل کرتے تھے، میں اپنے دل میں ارادہ کر لیتا تھا کہ چلنے کی تیاری کروں گا مگر پھر واپس آکر سستی کر جاتا تھا اور کہتا تھا کہ ابھی کیا ہے، جب چلنے کا وقت آئے گا تو تیار ہوتے کیا دیر لگتی ہے۔ اس طرح بات ٹلتی رہی۔ یہاں تک کہ لشکر کی روانگی کا وقت آگیا اور میں تیار نہ تھا۔ میں نے دل میں کہا کہ لشکر کو چلنے دو، میں ایک دو روز بعد راستہ ہی میں اس سے جا ملوں گا، مگر پھر وہی سستی مانع ہوئی، حتیٰ کہ وقت نکل گیا۔

اس زمانہ میں جبکہ میں مدینہ میں رہا میرا دل یہ دیکھ دیکھ کر بے حد کڑھتا تھا کہ میں جن لوگوں کے ساتھ پیچھے رہ گیا ہوں وہ یا تو منافق ہیں یا وہ ضعیف اور مجبور لوگ ہیں جن کو اللہ نے معذور رکھا ہے۔

جب نبیؐ تبوک سے واپس تشریف لائے تو حسبِ معمول آپؐ نے پہلے مسجد میں آکر

دو رکعت نماز پڑھی۔ پھر لوگوں سے ملاقات کے لیے بیٹھے۔ اس مجلس میں منافقین نے آ آکر اپنے عذرات لمبی چوڑی قسموں کے ساتھ پیش کرنے شروع کیے۔ یہ ۸۰ سے زیادہ آدمی تھے حضورؐ نے ان میں سے ایک ایک کی بناوٹی باتیں سنیں۔ ان کے ظاہری عذرات کو قبول کر لیا اور ان کے باطن کو خدا پر چھوڑ کر فرمایا: "خدا تمھیں معاف کرے"۔ پھر میری باری آئی۔ میں نے بڑھ کر سلام کیا۔ آپؐ میری طرف دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا: "تشریف لائیے! آپ کو کس چیز نے روکا تھا؟" میں نے عرض کیا: "خدا کی قسم اگر میں اہلِ دنیا میں سے کسی کے سامنے حاضر ہوا ہوتا تو ضرور کوئی نہ کوئی بات بنا کر اس کو راضی کرنے کی کوشش کرتا۔ باتیں بنانی تو مجھے بھی آتی ہیں۔ مگر میں آپؐ کے متعلق یقین رکھتا ہوں کہ اگر اس وقت کوئی جھوٹا عذر پیش کر کے میں نے آپؐ کو راضی کر بھی لیا تو اللہ ضرور آپؐ کو مجھ سے پھر ناراض کر دے گا۔ البتہ اگر سچ کہوں تو چاہے آپؐ ناراض ہی کیوں نہ ہوں، مجھے امید ہے کہ اللہ میرے لیے معافی کی کوئی صورت پیدا فرما دے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ میرے پاس کوئی عذر نہیں ہے جسے پیش کر سکوں میں جانے پر پوری طرح قادر تھا۔" اس پر حضورؐ نے فرمایا: "یہ شخص ہے جس نے سچی بات کہی۔ اچھا، اٹھ جاؤ اور انتظار کرو، یہاں تک کہ اللہ تمھارے معاملہ میں کوئی فیصلہ کرے۔" میں اٹھا اور اپنے قبیلہ کے لوگوں میں جا بیٹھا۔ یہاں سب کے سب میرے پیچھے پڑ گئے اور مجھے بہت ملامت کی کہ تو نے کوئی عذر کیوں نہ کر دیا۔ یہ باتیں سن کر میرا نفس بھی کچھ آمادہ ہونے لگا کہ پھر حاضر ہو کر کوئی بات بنا دوں۔ مگر جب مجھے معلوم ہوا کہ دو اور صالح آدمیوں (مرارہؓ بن ربیع اور ہلالؓ بن امیہ) نے بھی وہی سچی بات کہی جو میں نے کہی ہے، تو مجھے تسکین ہو گئی اور میں اپنی سچائی پر جما رہا۔

اس کے بعد نبیؐ نے عام حکم دے دیا کہ ہم تینوں آدمیوں سے کوئی بات نہ کرے۔ وہ دونوں تو گھر بیٹھ گئے، مگر میں گھر سے نکلتا تھا، جماعت کے ساتھ نماز پڑھتا تھا، بازاروں میں چلتا پھرتا تھا اور کوئی مجھ سے بات نہ کرتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سرزمین بالکل بدل گئی ہے۔ میں یہاں اجنبی ہوں اور اس بستی میں کوئی بھی میرا واقف کار نہیں۔ مسجد میں نماز کے لیے جاتا تو حسبِ معمول نبیؐ کو سلام کرتا مگر بس انتظار ہی کرتا رہ جاتا کہ جواب

کے لیے آپؐ کے ہونٹ جنبش کریں۔ نماز میں نظریں چرا کر حضورؐ کو دیکھتا تھا کہ آپؐ کی نگاہیں مجھ پر کیسی پڑتی ہیں مگر وہاں حال یہ تھا کہ جب تک میں نماز پڑھتا آپؐ میری طرف دیکھتے رہتے اور جہاں میں نے سلام پھیرا کہ آپ نے میری طرف سے نظر ہٹائی۔ ایک روز میں گھبرا کر اپنے چچا زاد بھائی اور بچپن کے یار ابو قتادہؓ کے پاس گیا اور ان کے باغ کی دیوار پر چڑھ کر انھیں سلام کیا مگر اس اللہ کے بندے نے سلام کا جواب تک نہ دیا۔ میں نے کہا: "ابوقتادہ! میں تم کو خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا میں خدا اور اس کے رسولؐ سے محبت نہیں رکھتا؟" وہ خاموش رہے۔ میں نے پھر پوچھا۔ وہ پھر خاموش رہے۔ تیسری مرتبہ جب میں نے قسم دے کر یہی سوال کیا تو انھوں نے بس اتنا کہا کہ "اللہ اور اس کا رسولؐ ہی بہتر جانتا ہے" اس پر میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے اور میں دیوار سے اتر آیا۔ انہی دنوں ایک دفعہ میں بازار سے گذر رہا تھا کہ شام کے قبطیوں میں سے ایک شخص مجھے ملا اور اس نے شاہِ غسان کا خط حریر میں لپٹا ہوا مجھے دیا۔ میں نے کھول کر پڑھا تو اس میں لکھا تھا کہ "ہم نے سنا ہے تمھارے صاحب نے تم پر ستم توڑ رکھا ہے، تم کوئی ذلیل آدمی نہیں ہو، نہ اس لائق ہو کہ تمھیں ضائع کیا جائے۔ ہمارے پاس آجاؤ۔ ہم تمھاری قدر کریں گے؟" میں نے کہا: یہ ایک اور بلا نازل ہوئی اور اسی وقت اس خط کو چولہے میں جھونک دیا۔

چالیس دن اس حالت میں گذر چکے تھے کہ نبیؐ کا قاصد حکم لے کر آیا کہ اپنی بیوی سے بھی علیحدہ ہو جاؤ۔ میں نے پوچھا "کیا طلاق دے دوں؟ جواب ملا۔ نہیں۔ بس الگ رہو۔ چنانچہ میں نے اپنی بیوی سے کہہ دیا کہ تم اپنے میکے چلی جاؤ اور انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اس معاملہ کا فیصلہ کر دے۔

پچاسویں دن صبح کی نماز کے بعد میں اپنے مکان کی چھت پر بیٹھا ہوا تھا اور اپنی جان سے بیزار ہو رہا تھا کہ یکایک کسی شخص نے پکار کر کہا۔ "مبارک ہو کعبؓ بن مالک" میں یہ سنتے ہی سجدہ میں گر گیا اور میں نے جان لیا کہ میری معافی کا حکم ہو گیا ہے۔ پھر فوج در فوج لوگ بھاگے چلے آرہے تھے اور ہر ایک دوسرے سے پہلے پہنچ کر مجھ کو مبارک باد دے رہا تھا کہ تیری توبہ قبول ہو گئی۔ میں اٹھا اور سیدھا مسجد نبویؐ کی طرف چلا۔ دیکھا کہ نبیؐ کا چہرہ

خوشی سے دمک رہا ہے۔ میں نے سلام کیا تو فرمایا: "تجھے مبارک ہو، یہ دن تیری زندگی میں سب سے بہتر دن ہے۔" میں نے پوچھا: "یہ معافی حضورؐ کی طرف سے ہے یا خدا کی طرف سے ہے؟" فرمایا: "خدا کی طرف سے ہے۔" میں نے عرض کیا: "یارسول اللہؐ! میری توبہ میں یہ بھی شامل ہے کہ میں اپنا سارا مال خدا کی راہ میں صدقہ کر دوں۔" فرمایا: "کچھ رہنے دو کہ یہ تمھارے لیے بہتر ہے۔" میں نے اس ارشاد کے مطابق اپنا خیبر کا حصہ رکھ لیا۔ باقی سب صدقہ کر دیا۔ پھر میں نے خدا سے عہد کیا کہ جس راست گفتاری کے صلے میں اللہ نے مجھے معافی دی ہے اس پر تمام عمر قائم رہوں گا۔ چنانچہ آج تک میں نے کوئی بات جان بوجھ کر خلافِ واقعہ نہیں کہی۔ اور خدا سے امید رکھتا ہوں کہ آئندہ بھی اس سے بچائے گا۔" (متفق علیہ)

تحسین وہمّت افزائی

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فضائلِ اخلاق کی تعمیر، رذائل کی بیخ کنی اور مختلف تعمیری صلاحیتوں کو نشوونما دینے کے لیے جہاں اوصافِ حمیدہ اختیار کرنے اور رذائل سے اجتناب کرنے کی تلقین فرماتے وہیں آپ پسندیدہ کاموں پر صحابہؓ کی ہمت افزائی بھی فرماتے۔ اُن کو داد و تحسین سے نوازتے۔ جس کی وجہ سے اچھے کاموں پر انھیں استحکام حاصل ہوتا۔ راہِ حق میں پیش آنے والی تلخیوں میں بھی چاشنی محسوس ہوتی۔

دورِ ابتلا و آزمائش میں آپ کا گزر حضرت عمار بن یاسرؓ اور اُن کے گھر والوں کے پاس سے ہوا۔ وہ کفار کی اذیتوں کا نشانہ بنے ہوئے تھے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس کربناک عالم میں دیکھا تو ان کی دلجوئی اور ہمت افزائی کرتے ہوئے فرمایا:

اَبْشِرُوْا آلَ یَاسِرٍ فَاِنَّ مَوْعِدَکُمُ الْجَنَّۃُ۔ (طبرانی۔ حاکم)

اے یاسر کے خاندان والو! تمھیں خوشخبری ہو، تمھارے لیے جنت کا وعدہ ہے۔

رسول خداؐ کے یہ الفاظ خاندان یاسرؓ کے زخموں کے لیے مرہم ثابت ہوئے ہوں گے۔ اللہ کے رسولؐ کی زبان سے اپنے بارے میں کلماتِ خیر سننے کے بعد یقیناً کفار کی ایذا رسانیوں میں بھی انھوں نے ایک خاص قسم کی لذت محسوس کی ہو گی۔

ایک بار ایک شخص نبی کریمؐ سے ملاقات کے لیے آیا۔ آپؐ نے دیکھا کہ اُس کی ہتھیلیوں پر نشانات اور گڈّے پڑے ہوئے ہیں۔ آپؐ نے وجہ معلوم کی تو اس نے کہا کہ اے اللہ کے رسولؐ! کسبِ حلال کے لیے محنت کرنے کی وجہ سے یہ نشانات پڑ گئے ہیں۔ آپؐ نے فرطِ محبت میں اس کے ہاتھ چوم لیے۔ غور کیجیے! آنحضورؐ کے اس عمل سے اس کا دل کتنا خوش اور اُس کا حوصلہ کتنا بلند ہوا ہو گا۔

غزوۂ تبوک جن سخت حالات میں پیش آیا اس کا اندازہ آپ کو اچھی طرح ہے۔
اس موقع پر آنحضورؐ نے مسلمانوں سے انفاق وایثار کی اپیل کی تو حضرت عثمان غنیؓ نے نو سو اونٹ، سو گھوڑے اور ایک ہزار دینار پیش کیے۔ اللہ کے رسولؐ ان دیناروں کو اچھالتے جاتے اور فرماتے جاتے: آج کے بعد عثمان غنیؓ کو کوئی گناہ نقصان نہیں پہنچائے گا۔
اس موقع پر سب سے زیادہ ایثار اس غریب محنت کش انصاری نے کیا جس نے دن بھر پانی کھینچ کھینچ کر چار سیر چھوہارے کمائے اور دو سیر چھوہارے اہل وعیال کے لیے رکھ کر دو سیر آپؐ کی خدمت میں لا حاضر کیے۔ آنحضورؐ نے ان کے جذبۂ ایثار کی قدر کرتے ہوئے ان کی حوصلہ افزائی کی اور فرمایا: ”ان چھوہاروں کو قیمتی مالوں کے ڈھیر پر بکھیر دو۔“
(محسنِ انسانیتؐ)

اشارات وغیرہ سے اپنی باتوں کو واضح کرنا

مخاطب کو اچھی طرح سمجھانے اور اپنی بات کو واضح کرنے کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بسا اوقات ہاتھ کے اشاروں سے مدد لیتے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ آپؐ صحابہؓ کے سامنے کچھ خطوط کھینچتے اور ان کے ذریعہ اپنی بات کو واضح کرتے۔ اس طرح سے حاضرین کے ذہن آسانی سے ان تصورات کو قبول کر لیتے جو آپؐ ان کو ذہن نشین کرانا چاہتے تھے۔ دیکھا گیا ہے کہ جب کوئی سمجھانے والا ہاتھ کے اشارہ سے یا خطوط کی مدد سے اپنی بات سمجھاتا ہے تو وہ حاضرین کے ذہن میں نقش ہو جاتی ہے۔ نبی کریمؐ اپنے طریقۂ تعلیم و تربیت میں اس بات کو خاص طور پر ملحوظ رکھتے تھے کہ اگر کوئی اہم بات ہوتی یا صرف زبانی سمجھانا مشکل ہوتا تو آپؐ مختلف طریقوں سے اس کی وضاحت فرماتے۔ کبھی آپؐ ہاتھ کے اشارے سے اپنی بات کو اس طرح مخاطب کے ذہن میں اتارتے کہ بات کا ماله وما علیه اس پر پوری طرح واضح ہو جاتا۔

بخاریؒ نے سہلؓ بن الساعدی سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

أَنَا وَكَافِلُ الْيَتِيمِ فِي الْجَنَّةِ كَهَاتَيْنِ۔ وَأَشَارَ بِالسَّبَّابَةِ وَالْوُسْطَى۔ (بخاری)

میں اور یتیم کی کفالت کرنے والے جنت میں ان دونوں انگلیوں کی طرح ہوں گے یہ کہتے ہوئے آپؐ نے درمیانی اور شہادت والی انگلی سے اشارہ فرمایا۔

غور کیجیے جب خدا کے رسولؐ نے اپنی شہادت اور بیچ کی انگلی اٹھا کر صحابہ کرامؓ سے یہ فرمایا ہو گا کہ میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں ان دونوں انگلیوں کی طرح

ہوں گے۔ یعنی ایک دوسرے سے بالکل قریب ہوں گے۔ دونوں کے درمیان کوئی حائل نہ ہوگا تو وہ صحابہؓ جو حصولِ جنت کے لیے اپنی دنیا تک داؤں پہ لگائے ہوئے تھے، اور رسولِ خدا کا قرب ان کے لیے ہر نعمت سے زیادہ قیمتی تھا تو کیا اس ارشاد اور اشارے کے بعد ہر صحابی کے دل میں یہ عزم پیدا نہیں ہوا ہوگا کہ مجھے یتیم کی کفالت کر کے اس نعمت کو ضرور حاصل کرنا چاہیے۔

ایک بار سفیان بن عبداللہ بجلیؓ نے اللہ کے رسولؐ سے دریافت کیا کہ "اے رسولِ خدا یہ ارشاد فرمایئے کہ آپؐ کی نظر میں میرے لیے کون سی چیز زیادہ خطرناک ہے؟" تو نبی کریمؐ نے اپنی زبان کو پکڑ کر فرمایا "یہ"

آپؐ نے سفیان بن عبداللہ بجلیؓ کو زبان کی خطرناکی کی جانب مؤثر انداز میں متوجہ کیا۔ اگر زبان پر آدمی قابو نہ رکھ سکے، اس کو بے احتیاطی سے نہ بچا سکے تو یہ انسان کے لیے سب سے زیادہ بربادی و ہلاکت کا سبب بن جاتی ہے۔ آنحضورؐ نے زبان کو پکڑ کر جہاں اس بات کی وضاحت کر دی کہ مجھے زبان کی بے احتیاطی کے استعمال سے سب سے زیادہ خطرہ محسوس ہوتا ہے وہیں آپؐ نے زبان کو پکڑ کر مخاطب کے ذہن میں یہ بات بھی بٹھا دی کہ زبان پر گرفت ہونا ضروری ہے اور اس پر تمھیں پوری طرح قابو رکھنا چاہیے۔

بخاری و مسلم نے ابوموسیٰ اشعریؓ کی روایت نقل کی ہے:

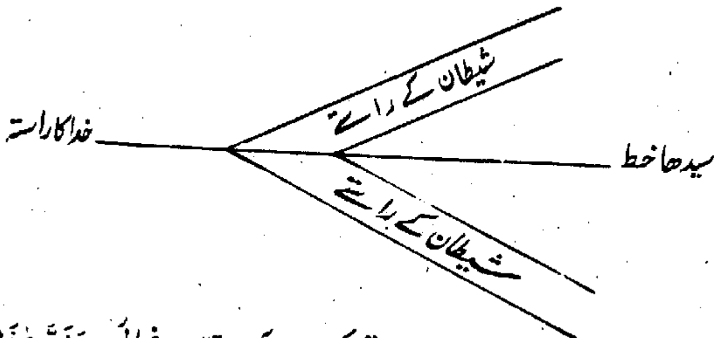
قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔ اَلْمُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِ کَالْبُنْیَانِ یَشُدُّ بَعْضُہٗ بَعْضًا وَ شَبَّکَ رَسُوْلُ اللّٰہِ بَیْنَ اَصَابِعِہٖ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مومن مومن کے لیے عمارت کی مانند ہے جس کا ایک حصہ دوسرے حصہ کو پیوست کیے ہوئے ہوتا ہے اور رسول اللہؐ نے اپنے ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال کر جال بنا کر دکھایا۔

اس حدیث میں آنحضورؐ نے اہلِ ایمان کے باہمی تعلق کی کس خوب صورت و دلنشیں انداز میں وضاحت فرمائی۔ سننے اور دیکھنے والا جب انگلیوں کے جال کو دیکھے گا تو مسلمانوں کے باہمی

گہرے تعلق کی صحیح تصویر اس کے سامنے واضح ہو جائے گی ۔

ایک بار رسول خدا صحابہؓ کے درمیان تشریف فرما تھے آپ نے اپنے ہاتھ سے زمین پر ایک سیدھا خط کھینچا اور فرمایا یہ خدا کا راستہ ہے ۔ پھر اس سیدھے راستے کی دائیں جانب دو خط کھینچے اور دو خط بائیں جانب اور فرمایا کہ یہ خطوط شیطان کے راستے ہیں :



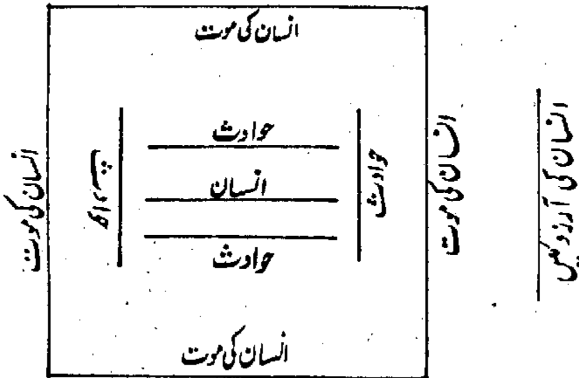
اس کے بعد آپ نے سیدھے خط پر ہاتھ رکھا اور یہ آیت تلاوت فرمائی : وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۔ (الانعام - ۱۵۴)

" یہ میرا سیدھا راستہ ہے تم اسی کو اختیار کرو اور دوسرے راستوں کو اختیار نہ کرو کہ وہ تم کو اس کے راستے سے ہٹا کر تمھیں پراگندہ کر دیں گے ۔ اسی کی اللہ تعالیٰ نے تمھیں وصیت کی ہے تاکہ تم تقویٰ حاصل کر سکو ۔"

اس آیت کی تشریح آپ نے خطوط کھینچ کر نہایت عام فہم انداز میں فرمائی اور ذہنوں میں یہ بات جاگزیں کر دی کہ عزت وسربلندی اور جنت تک پہنچانے والا صرف یہی راستہ ہے اور اس کے علاوہ باقی تمام راستے خواہ وہ باطل ادیان ہوں یا دوسرے افکار ونظریات سب شیطانی راستے ہیں جو ہلاکت وبربادی اور جہنم تک پہنچانے والے ہیں ۔

صحیح بخاری میں منقول ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ ہمیں سمجھانے کے لیے رسول اللہ ؐ نے ایک مربع نما شکل بنائی ۔ اس شکل کے باہر ایک خط کھینچا اور اس کے

درمیان میں چھوٹے چھوٹے خطوط کھینچے۔ پھر مربع کے درمیان میں انگلی رکھ کر فرمایا: "یہ انسان ہے اور مربع بنانے والے خطوط اس کی موت ہیں اور یہ چھوٹے چھوٹے خطوط حوادث و مصائب ہیں جو انسان پر حملہ کرتے رہتے ہیں۔ اگر ان کا نشانہ چوک جاتا ہے تو بڑھاپا آلیتا ہے اور مربع سے باہر جو خط ہے وہ انسان کی آرزو اور تمنا ہے۔ یہاں تک آدمی کبھی نہیں پہنچ پاتا۔



اس خاکہ کی مدد سے آنحضورؐ نے یہ بات واضح فرما دی کہ انسان اور اس کی آرزوؤں کے درمیان حادثات و مصائب حائل ہیں اور پھر موت چاروں طرف سے انسان کو گھیرے ہوئے ہے جس سے کوئی راہِ فرار نہیں ہے۔ انسان کو کتنی بھی طویل زندگی کیوں نہ ملے اس کی آرزوئیں ادھوری رہ جاتی ہیں اور کوئی بھی انسان زندگی میں اپنی تمناؤں کی تکمیل نہیں کر پاتا۔

باہمی گفتگو اور سوال و جواب

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بات بہتر طور پر ذہن نشین کرانے کے لیے کبھی تبادلۂ خیال کے طرز کو اختیار فرماتے، کبھی سوال و جواب کے انداز پر گفتگو کرتے۔ اس سے کئی فائدے حاصل ہوتے۔ تمام موجود صحابہؓ پوری طرح متوجہ رہتے۔ وہ گفتگو میں دلچسپی لیتے۔ انھیں غور و فکر کرنے کا موقع ملتا جس کی وجہ سے ان کی صلاحیت نکھرتی۔ اس طرح سوال و جواب کے ذریعہ حقائق کو بہت ہلکے پھلکے انداز میں ذہنوں میں بٹھا دیا جاتا۔ آنحضورؐ سوال و جواب کے انداز میں صحابہ کرامؓ کے فکر و عمل کو کس طرح جلا بخشتے، اس کی چند مثالیں یہاں پر درج کی جارہی ہیں:

۱۔ رسولِ خدا:	أَتَدْرُونَ مَنِ الْمُسْلِمُ؟	تم جانتے ہو مسلمان کون ہے؟
صحابہ کرامؓ:	اَللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ!	اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ علم ہے
رسولِ خدا:	اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِسَانِهِ وَيَدِهِ	مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان محفوظ رہیں۔
رسولِ خدا:	أَتَدْرُونَ مَنِ الْمُؤْمِنُ؟	کیا تم جانتے ہو مومن کون ہے؟
صحابہ کرامؓ:	اَللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ!	اللہ اور اس کے رسول بہتر طور پر جانتے ہیں۔

رسولِ خدا: اَلْمُؤْمِنُ مَنْ أَمِنَهُ الْمُؤْمِنُونَ عَلٰى أَنْفُسِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ۔

مومن وہ ہے جس سے اہلِ ایمان اپنی جانوں اور مالوں کے سلسلہ میں محفوظ رہیں۔ (مسند احمد)

۲۔ ایک بار آنحضورؐ نے صحابہ کرامؓ سے دریافت فرمایا کہ اگر تم میں کسی کے دروازہ کے

سامنے نہر بہہ رہی ہو اور کوئی شخص روزانہ پانچ مرتبہ غسل کرے تو کیا اس پر میل باقی رہ سکتا ہے؟ صحابۂ کرامؓ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسولؐ اس پر ذرا بھی میل باقی نہیں رہے گا، آپؐ نے فرمایا: یہی حال پانچوں نمازوں کا ہے کہ اللہ ان کے ذریعہ گناہوں کو مٹا دیتا ہے! (مسلم)

۴۔ رسول خدا: کیا تم جانتے ہو مفلس کون ہے؟

صحابۂ کرامؓ: ہم مفلس اس کو سمجھتے ہیں جس کے پاس نہ کوئی سامان ہو اور نہ درہم و دینار۔

رسول خداؐ: میری امت کا مفلس وہ شخص ہے جو قیامت میں نماز، روزے اور زکوٰۃ لے کر حاضر ہوگا لیکن اس نے کسی کو گالی دی ہوگی، کسی پر تہمت لگائی ہوگی کسی کا مال کھایا ہوگا، کسی کا خون بہایا ہوگا، کسی کو زد و کوب کیا ہوگا۔ چنانچہ اس کے خلاف ان مدعیوں کو اس کی نیکیاں دے دی جائیں گی جب اس کے پاس نیکیاں ختم ہو جائیں گی اور مدعی باقی رہیں گے تو ان کے گناہ اس پر لاد دیئے جائیں گے۔ یہاں تک کہ ان گناہوں کی پاداش میں اسے جہنم میں جھونک دیا جائے گا!

جس طرح آپؐ سوال کر کے مخاطبین کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتے اور پھر کوئی حقیقت ان کے ذہن نشین کر دیتے اسی طرح آپؐ اپنے مخاطبین، احباب و رفقاء کو بھی سوالات کرنے کا موقع دیتے تاکہ ان کے ذہنوں میں ابھرنے والے شکوک و شبہات بھی دور کیے جا سکیں اور اگر وہ کسی مسئلہ میں رہنمائی چاہیں وہ بھی دی جا سکے۔ آپؐ کبھی سوال کرنے کی اجازت دیتے۔ کبھی سوال کرنے پر آمادہ کرتے، کبھی سوال کرنے والے کی ہمت افزائی فرماتے۔ اس طرح گفتگو کرنے والے کو پوری طرح مطمئن کر دیتے۔ عام طور سے دیکھا گیا ہے کہ کسی منصب و ذمہ داری پر فائز لوگ ایسے مواقع پر کنارہ کشی کی کوشش کرتے ہیں جہاں انھیں جوابدہی سے دوچار ہونا پڑے، مگر اللہ کے رسولؐ اپنے عظیم انقلاب کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لیے اپنے احباب و رفقاء کے ذہنوں میں اٹھنے والے سوالات کا تشفی بخش جواب دینا اور پیدا ہوتے والے شکوک کو رفع کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ احادیث کی کتابوں میں اس طرح کی بہت سی مثالیں

ہیں کہ آپؐ نے مجلس میں سوالات کرنے کا ماحول بنایا اور پھر آپؐ نے نہایت اطمینان سے تسلی بخش جوابات دیئے مگر آپؐ کے یہ جوابات نہایت مختصر اور جامع ہوتے تھے۔ آپؐ سوال کرنے کا کس قدر موقع دیتے اس کا اندازہ اس باہمی گفتگو سے ہوتا ہے جو عمرو بن عبسہ نے آپؐ سے کی تھی۔

س: شروع میں کون لوگ (دعوت کے کام میں) آپؐ کے ساتھ تھے؟

ج: ایک مردِ آزاد اور ایک غلام (یعنی حضرت ابوبکرؓ اور حضرت بلالؓ)۔

س: اسلام کیا ہے؟ (یعنی اس کی اخلاقی حیثیت)

ج: پاکیزہ گفتار اور بھوکوں کو کھانا کھلانا۔

س: ایمان کیا ہے؟ (یعنی ایمان کا جوہر)

ج: صبر اور سخاوت۔

س: کون سا اسلام افضل (معیاری) ہے؟

ج: اس شخص کا جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں۔

س: کون سا ایمان افضل (معیاری) ہے؟

ج: جس ایمان کے ساتھ پسندیدہ اخلاق پائے جائیں۔

س: کس قسم کی نماز افضل (معیاری) ہے؟

ج: جس نماز میں دیر تک قیام کیا جائے

س: کیسی ہجرت افضل (معیاری) ہے؟

ج: یہ کہ تم ان چیزوں سے بچو جو تمھارے رب کو ناپسند ہیں۔

س: کس قسم کا جہاد افضل (معیاری) ہے؟

ج: جس کا گھوڑا بھی میدان میں مارا جائے اور خود بھی شہادت پائے۔

س: کون سا وقت (نفل عبادت کے لیے) سب سے بہتر ہے؟

ج: رات کا پچھلا پہر! (مشکوٰۃ)

ترمذی نے حضرت ابوہریرہؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک بار رسول اللہؐ سے سوال

کیا گیا کہ اے اللہ کے رسولؐ! انسانوں کو دوزخ میں پہنچانے کے زیادہ تر موجبات کیا ہیں؟

آپؐ نے فرمایا:۔ اَلْفَمُ وَالْفَرْجُ "دہن اور شرم گاہ"

"اَلْفَمُ" سے اشارہ ہے گفتگو اور کھانے پینے کی طرف اور "اَلْفَرْجُ" سے اشارہ ہے جنسی خواہشات کی طرف۔

ایک بار حضرت علیؓ نے سوال کیا کہ آپؐ اپنے مسلک کی وضاحت فرمائیں۔ سوال بہت اہم تھا اس لیے آپؐ نے نہایت جامع جواب دیا جس کے ذریعہ آپؐ نے اپنے اندازِ فکر اور طرزِ عمل کی پوری تصویر کھینچ دی۔

آپؐ نے فرمایا:

اَلْمَعْرِفَةُ رَأْسُ مَالِيْ وَالْعَقْلُ اَصْلُ دِيْنِيْ وَالْحُبُّ اَسَاسِيْ۔ وَالشَّوْقُ مَرْكَبِيْ وَذِكْرُ اللهِ اَنِيْسِيْ۔ وَالثِّقَةُ كَنْزِيْ وَالْحُزْنُ رَفِيْقِيْ۔ وَالْعِلْمُ سِلَاحِيْ وَالصَّبْرُ رِدَائِيْ وَالرِّضَاءُ غَنِيْمَتِيْ وَالْعَجْزُ فَخْرِيْ وَالزُّهْدُ حِرْفَتِيْ وَالْيَقِيْنُ قُوَّتِيْ وَالصِّدْقُ شَفِيْعِيْ وَالطَّاعَةُ حَسْبِيْ وَالْجِهَادُ خُلُقِيْ وَقُرَّةُ عَيْنِيْ فِي الصَّلٰوةِ

(الشفاء)

عرفان میرا سرمایہ ہے، عقل میرے دین کی بنیاد ہے، محبت میری اساس ہے۔ شوق میری سواری ہے۔ اللہ کا ذکر میرا مونس ہے۔ اعتماد میرا خزانہ ہے، غم میرا رفیق ہے۔ علم میرا ہتھیار ہے۔ صبر میری چادر ہے رضاءِ الٰہی میری غنیمت ہے۔ عاجزی میرا سرمایۂ فخر ہے، اور زہد میرا پیشہ ہے۔ یقین میری طاقت ہے۔ صدق میرا سفارشی ہے۔ فرماں برداری میرا بچاؤ ہے۔ جہاد میرا شیوہ ہے اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔

تشبیہات و تمثیلات

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وعظ و نصیحت کرنے اور اپنی بات کو ذہن نشین کرانے اور مؤثر بنانے کے لیے بسا اوقات ایسی چیزوں سے تشبیہ دیتے اور مثالوں میں ایسی چیز کو پیش کرتے جو لوگوں کے مشاہدہ میں رہتیں تاکہ آپؐ کی بات واضح ہو جائے۔ آپؐ نے فرمایا:

اَلْمُؤْمِنُ مِرْاٰۃُ الْمُؤْمِنِ "مؤمن مؤمن کا آئینہ ہے"

یہاں آپؐ نے ایک مؤمن کو دوسرے مؤمن کے لیے آئینہ سے تشبیہ دی ہے اور اس تشبیہ کے ذریعہ آپؐ نے سننے والے کے ذہن میں مؤثر انداز میں یہ بات ذہن نشین کرا دی کہ ایک مؤمن کے لیے دوسرا مؤمن آئینہ کی طرح ہے۔ آئینہ صرف اسی وقت آدمی کے عیب کو ظاہر کرتا ہے جب آدمی آئینے کے سامنے ہو۔ اگر آدمی سامنے نہ ہو تو آئینہ میں کچھ ظاہر نہیں ہوتا۔ اسی طرح سے ایک مؤمن دوسرے مؤمن کی کمی صرف اسی کے سامنے بتاتا ہے پیٹھ پیچھے کچھ نہیں کہتا۔ آئینہ صرف اتنی ہی کمی دکھاتا ہے جتنی آدمی کے چہرہ پر ہوتی ہے، اس کو ذرا بھی گھٹا بڑھا کر نہیں دکھاتا۔ اسی طرح مؤمن بھی اگر اپنے بھائی کو کسی کمی کی طرف متوجہ کرتا ہے تو اس کی کمی کو بلا کم وکاست جوں کا توں بیان کر دیتا ہے۔ اگر دیکھنے والا آئینہ میں اپنے چہرہ کے داغ دھبے دیکھتا ہے تو وہ دیکھ کر آئینہ کو برا بھلا نہیں کہتا۔ اس کو پٹخ نہیں دیتا بلکہ اپنے داغ دھبوں کی فکر کرتا ہے اور آئینہ کو احتیاط سے اٹھا کر رکھ دیتا ہے تاکہ وقفہ کے بعد پھر دیکھے اور یہ جانکاری حاصل کرے کہ اب اس کے داغ دھبوں کا کیا حال ہے۔ اسی طرح سے ایک مؤمن کے سامنے اس کا بھائی اس کی کوئی کمی بیان کرتا ہے تو وہ ناراض نہیں ہوتا۔ اس کو برا بھلا نہیں کہتا ہے بلکہ اس کا شکریہ ادا کرکے

اس سے یہ خواہش کرتا ہے کہ اگر آئندہ کوئی غلطی ہو تو اس پر بھی اس کو متنبہ کر دیا جائے۔

"ایک مومن دوسرے مومن کا آئینہ ہوتا ہے" اس تشبیہ سے اس طرف بھی اشارہ ہے کہ ایک مومن کی خوشی یا غم کو دوسرے مومن کے چہرے پر پڑھا جانا چاہیئے۔ اگر ایک مسلمان بھائی کے چہرہ پر غم و افسردگی کے آثار ہیں تو دوسرا بھائی بھی اس غم میں شریک نظر آنا چاہیئے اور اگر ایک مسلمان بھائی کے چہرہ سے مسرت و شادمانی ٹپک رہی ہے تو دوسرے مسلمان بھائی کے چہرے پر بھی مسرت و شادمانی کی چمک ہونی چاہیئے۔

آنحضورؐ نے اس مختصر سی تشبیہ کے ذریعہ مخاطب اور سننے والے کو کتنا کچھ دیا ہے اور مسلمانوں کے باہمی تعلق کی کتنے اچھے انداز میں وضاحت فرمائی ہے۔

نسائی نے حضرت انسؓ کی سند سے درج ذیل روایت نقل کی ہے:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَثَلُ الْمُؤْمِنِ الَّذِيْ يَقْرَأُ الْقُرْآنَ كَمَثَلِ الْاُتْرُجَّةِ رِيْحُهَا طَيِّبٌ وَطَعْمُهَا طَيِّبٌ وَمَثَلُ الْمُؤْمِنِ الَّذِيْ لَا يَقْرَأُ الْقُرْآنَ كَمَثَلِ التَّمْرَةِ طَعْمُهَا طَيِّبٌ وَلَا رِيْحَ لَهَا۔ وَمَثَلُ الْفَاجِرِ الَّذِيْ يَقْرَأُ الْقُرْآنَ كَمَثَلِ الرَّيْحَانَةِ رِيْحُهَا طَيِّبٌ وَطَعْمُهَا مُرٌّ وَمَثَلُ الْفَاجِرِ الَّذِيْ لَا يَقْرَأُ الْقُرْآنَ كَمَثَلِ الْحَنْظَلَةِ طَعْمُهَا مُرٌّ وَلَا رِيْحَ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اس مومن کی مثال جو قرآن پڑھتا ہے اترجہ[1] کی مانند ہے جس کی بو بھی اچھی ہوتی ہے اور ذائقہ بھی۔ اس مومن کی مثال جو قرآن نہیں پڑھتا کھجور کی طرح ہے جس کا ذائقہ اچھا ہو اور اس میں کوئی بو نہ ہو۔ اس فاجر کی مثال جو قرآن پڑھتا ہے ریحانہ[2] کی مانند ہے جس کی بو اچھی ہوتی ہے، اور ذائقہ کڑوا، اور اس فاجر کی مثال جو قرآن نہیں پڑھتا اندرائن کی مانند ہے جس کا ذائقہ کڑوا ہوتا ہے اور اس میں

---

[1] اترجہ: سنترہ کی مانند ایک خوش ذائقہ اور خوشبودار پھل

[2] ریحانہ: ایک خوشبودار پھول

لَهَا وَمَثَلُ جَلِيْسِ السُّوْءِ كَصَاحِبِ الْكِيْرِ اِنْ لَمْ يُصِبْكَ مِنْ سَوَادِهٖ اَصَابَكَ مِنْ دُخَانِهٖ ۔ (نسائی)	کوئی بو نہیں ہوتی ؛ برے ساتھی کی مثال بھی بھٹی والے (لوہار) کی طرح ہے، اگر تمھیں اس کی سیاہی نہ لگے تو اس کا دھواں ضرور لگے گا ۔

آنحضورؐ نے مومن اور فاجر اور ان کے قرآن پڑھنے نہ پڑھنے کے عمل کے اثرات کو کس طرح محسوس چیزوں سے تشبیہہ دے کر نہ صرف قابلِ فہم بنایا بلکہ اثر انگیز بھی! اسی طرح بری صحبت سے بچنے کے لیے کس قدر مؤثر مثال دی ۔ اگر کوئی شخص لوہار کا دوست ہو۔ لوہار کے پاس اٹھے بیٹھے تو کوئلہ کی سیاہی اور چنگاریوں سے اپنے کو بچا بھی لے تو بھٹی کا دھواں بہر حال اس کو لگے گا ۔ اسی طرح سے کوئی شخص برے انسانوں کی صحبت اختیار کرے تو اس کے غلط افکار و نظریات اور بری عادتوں کا اثر اس کی زندگی پر ضرور پڑے گا اگر وہ یہ اثر شعوری طور پر قبول نہ کرے تو یہ چیزیں غیر شعوری طور پر اثر انداز ہوں گی ۔

کتبِ احادیث میں ایسی بہت سی حدیثیں موجود ہیں جن میں آپؐ نے کسی تشبیہہ یا تمثیل کے ذریعہ اپنی بات کو اس طرح واضح کیا کہ سننے والے کے ذہن میں وہ ہر پہلو سے جاگزیں ہو گئیں ۔

مَثَلُ الْمُؤْمِنِيْنَ فِيْ تَوَادِّهِمْ وَ تَعَاطُفِهِمْ وَ تَرَاحُمِهِمْ كَالْجَسَدِ الْوَاحِدِ اِذَا شْتَكٰى مِنْهُ عُضْوٌ تَدَاعٰى لَهٗ سَائِرُ الْجَسَدِ بِالسَّهْرِ وَالْحُمّٰى ۔ (متفق علیہ)	مسلمانوں کی مثال آپس میں محبت کرنے، پیار کرنے اور رحم کرنے کے سلسلہ میں ایک جسم کی طرح ہے، اگر جسم کا کوئی حصہ بیمار ہوتا ہے تو باقی حصے تکلیف اور جاگنے میں اس کے شریک ہوتے ہیں ۔

اس حدیث میں آپؐ نے مسلمانوں کے باہمی تعلق اور ربط و محبت کو ایک مثال کے ذریعہ واضح کیا ہے کہ مسلم سماج اور معاشرہ جسد واحد کی طرح ہے ۔ اگر ایک عضو میں بھی تکلیف

ہوتی ہے تو پورا جسم تکلیف میں شریک ہوتا ہے۔ اگر پیر کی چھوٹی انگلی میں درد ہو تو آنکھیں سو نہیں پاتی ہیں۔ دل و دماغ کو چین نہیں پڑتا۔ زبان کراہتی ہے اور چہرہ تکلیف کے احساس کی عکاسی کرتا ہے۔ اس طرح اگر ایک مسلمان بھی کسی تکلیف یا مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے تو تمام مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھیں۔ ایک مسلمان کی خوشی تمام مسلمانوں کی خوشی ہوتی ہے اور ایک مسلمان کا غم تمام مسلمانوں کا غم! کاش مسلمان اس حقیقت کو سمجھتے اور اس پر عمل پیرا ہوتے۔

قصص و واقعات

ذہن سازی میں قصوں کو بڑا دخل ہے۔ انسان کہانی کی زبان میں جو کچھ سنتا ہے اس سے اثر لیتا ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ انسان کہانیاں پڑھتے پڑھتے رونے لگتا ہے تو کبھی ہنسنے لگتا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ قصہ کہانی اپنا ایک اثر رکھتی ہے پھر اگر قصہ سچا ہو، کہنے والا بھی صادق اور امین ہو اور سننے والے بھی سچ کے شیدائی ہوں تو قصہ کی اثر انگیزی بہت بڑھ جاتی ہے۔ چنانچہ نبی اکرمؐ قصص و واقعات کے ذریعہ بہت سی باتوں کو ذہن نشین کراتے تھے۔ آپؐ محض تفریحِ طبع کے لیے قصے بیان نہیں کرتے تھے بلکہ بعض اہم پہلوؤں کو ذہن نشین کرنے کے لیے قصہ کا سہارا لیتے۔ جب آدمی کسی فکر کو دلائل سے ثابت کرتا ہے تو سننے والا نظریاتی طور پر اس کی پیش کردہ فکر کو تسلیم کر لیتا ہے اور عقلی طور پر اس سے مطمئن بھی ہو جاتا ہے مگر جب یہی فکر ایک واقعہ کی کڑیوں میں پیش کی جاتی ہے تو انسان اس کو قابلِ عمل سمجھتا ہے اور واقعہ کی روح جذبۂ عمل کو بیدار کر کے سننے والے کو عمل پر آمادہ کرتی ہے۔ چنانچہ اللہ کے رسولؐ بھی قصص و واقعات بیان کر کے روحِ عمل کو اجاگر کرتے رہتے تھے۔ احادیث کی کتابوں میں بے شمار واقعات ملتے ہیں جن کے ذریعہ آنحضورؐ نے جذبِ دروں کو جگایا ہے یہاں صرف چند واقعات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

(۱) تم سے پہلے تین آدمی تھے۔ وہ ایک سفر کے لیے نکلے۔ رات گذارنے کے لیے انھیں ایک غار میں پناہ لینا پڑی۔ جب وہ غار میں داخل ہو گئے تو پہاڑ کے اوپر سے ایک چٹان لڑھکی اور دروازہ پر آکر رک گئی جس کی وجہ سے دروازہ بند ہو گیا۔ انھوں نے

پریشان ہو کر کافی غور و فکر کے بعد کہا کہ اپنے نیک اعمال کے توسط سے اپنے لیے نجات کی دعا کرنا چاہیئے کیوں کہ ہماری نجات کا اب صرف یہی ایک راستہ ہے۔ چنانچہ ان میں سے ایک نے کہا!

"اے خدا میرے والدین بہت بوڑھے تھے اور میرا یہ معمول تھا کہ میں اپنی بکریوں کا دودھ ان سے پہلے کسی کو نہیں پلاتا تھا نہ اپنے بال بچوں کو اور نہ ہی غلام باندی کو ایک روز جب میں بکریوں کو چرانے لے گیا تو چارہ کی تلاش میں بہت دور نکل گیا جس کی وجہ سے واپسی میں مجھے دیر ہو گئی۔ چنانچہ جب گھر واپس آیا تو والدین سو چکے تھے۔ میں نے دودھ دوہا، مگر یہ پسند نہ کیا کہ والدین سے پہلے کسی کو پلاؤں اس لیے میں ہاتھ میں پیالہ لیے وہیں کھڑا رہا تاکہ ان کے بیدار ہونے پر دودھ ان کو پیش کر دوں۔ میرے بچے میرے پیروں کے پاس بھوک کی شدت سے رو رو کر بے حال ہو رہے تھے مگر میں نے یہ فیصلہ کر رکھا تھا کہ ان کی بیداری سے پہلے کسی کو دودھ نہیں پلاؤں گا۔ میں ان کے بیدار ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ جب وہ بیدار ہو گئے تو میں نے ان کو دودھ پیش کیا۔ اے خدا اگر میں نے یہ کام صرف تیری رضا کے لیے کیا ہو تو اس چٹان کی وجہ سے جو مصیبت ہمارے اوپر آئی ہے اس کو دور فرما دے۔" اس کے بعد غار کے منہ پر سے چٹان تھوڑی سی کھسک گئی مگر وہ اس سے نکل نہیں سکتے تھے۔

اب دوسرے نے دعا کی:

"اے اللہ میری ایک چچا زاد بہن تھی جو مجھے بہت محبوب تھی۔ ایک مرد عورت سے جتنی زیادہ محبت کر سکتا ہے اتنی ہی محبت مجھے اس سے تھی۔ چنانچہ میں نے اس سے لطف اندوز ہونے کا ارادہ کر لیا۔ مگر اس نے انکار کر دیا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ وہ خشک سالی کا شکار ہو گئی۔ وہ دستِ سوال دراز کرتے ہوئے میرے پاس آئی۔ میں نے اس شرط کے ساتھ اس کو ۱۲۰ دینار دینے کا وعدہ کر لیا کہ وہ اپنے آپ کو میری خواہش نفس کی تکمیل کے لیے میرے حوالہ کر دے۔ اس شرط پر اس نے رضامندی ظاہر کر دی۔ میں نے ۱۲۰ دینار اس کو دے دیئے۔ اور اس نے اپنے وجود کو میرے حوالہ

کردیا۔ اس کے بعد میں پوری طرح تیار ہو گیا۔ جب میں اس کی ٹانگوں کے درمیان بیٹھا تو اس نے کہا کہ "اللہ سے ڈرو اور پردۂ بکارت بغیر استحقاق کے زائل کرو۔" ان الفاظ کے سنتے ہی میں اس سے الگ ہو گیا۔ حالانکہ وہ مجھے سب سے زیادہ پیاری تھی اور میں پوری طرح اس پر قادر تھا اے خدا اگر میں نے یہ کام صرف تیری رضا کے لیے کیا ہے تو ہم جس مصیبت میں گرفتار ہو گئے ہیں اس سے نجات دلا دے۔" چنانچہ چٹان تھوڑی سی اور کھسک گئی لیکن وہ اب بھی اس سے نکل نہیں سکتے تھے۔

اب تیسرے شخص نے اپنی دعا شروع کی:

"اے خدا! ایک بار میں نے کچھ مزدوروں کو اُجرت پر رکھا۔ جب کام ختم ہو گیا تو میں نے ان کی مزدوری ان کے حوالے کر دی۔ البتہ ایک مزدور مزدوری لیے بغیر چلا گیا۔ میں نے اس کی مزدوری کو کاروبار میں لگا دیا۔ کاروبار بہت فائدہ بخش ثابت ہوا۔ اور یہ معمولی سی مزدوری بڑھتے بڑھتے بہت بڑے سرمائے میں تبدیل ہو گئی۔ ایک مدت کے بعد وہ میرے پاس آیا اور اس نے اپنی مزدوری طلب کی۔ میں نے اس سے کہا: "تم جو یہ بکریاں، گائیں اور غلام دیکھ رہے ہو، سب تمہاری مزدوری ہے۔ جاؤ یہ سب کچھ لے جاؤ۔" اس کو یقین نہ آیا۔ اس نے سمجھا کہ میں مذاق کر رہا ہوں چنانچہ وہ بولا "آپ مجھ سے مذاق نہ کریں۔ مجھے آپ صرف میری مزدوری دے دیں، میں اس وقت سخت ضرورت مند ہوں۔" میں نے اس سے کہا کہ میں تم سے مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ چنانچہ اس نے وہ سب مال و متاع لے لیا۔ اور کچھ نہیں چھوڑا ـــ اے اللہ اگر میں نے یہ کام تیری رضا کے لیے کیا ہے تو اس مصیبت سے ہم کو نجات دے۔" چنانچہ وہ چٹان مزید کھسکی اور غار کا منہ کھل گیا۔ یہ تینوں مسافر باہر نکل آئے اور چلتے بنے۔ (متفق علیہ)

(۲) بنی اسرائیل میں تین آدمی تھے۔ ان میں ایک کوڑھی تھا، دوسرا گنجا اور تیسرا اندھا۔ خدا نے ایک بار ان کا امتحان لینا چاہا۔ اس کے لیے اس نے ایک فرشتہ کو انسانی شکل میں بھیجا۔ وہ فرشتہ سب سے پہلے کوڑھی کے پاس آیا اور اس سے پوچھا: "تمہیں کیا چیز

سب سے زیادہ پسند ہے ؟"

کوڑھی نے کہا: "میری تمنا ہے کہ میرا کوڑھ پن دور ہو جائے جس کی وجہ سے لوگ مجھ سے گھن کرتے ہیں اور اس کے بجائے عمدہ رنگت اور خوب صورت کھال مل جائے"۔ فرشتہ نے اس کے پورے جسم پہ ایک مرتبہ ہاتھ پھیرا اور اسے اس کی طلب کردہ چیزیں مل گئیں۔ یعنی خوب صورت رنگت، خوب صورت جلد اور کوڑھ پن بھی دور ہو گیا۔ پھر اس فرشتہ نے پوچھا: "تمھیں کونسا مال سب سے زیادہ پسند ہے ؟" تو اس نے کہا "اونٹنی"۔ چنانچہ اس فرشتہ نے اسے ایک دس مہینے کی حاملہ اونٹنی دے دی۔ اور کہا اللہ تعالیٰ تمھارے اس مال میں برکت دے۔

پھر وہ فرشتہ گنجے کے پاس آیا اور اس سے بھی وہی سوال کیا جو وہ کوڑھی سے کر چکا تھا۔ گنجے نے جواب دیا: "میری سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ میرا گنجا پن دور ہو جائے اور مجھے خوب صورت بال نصیب ہو جائیں تاکہ لوگ مجھ سے نفرت کرنے کے بجائے مجھ سے محبت کریں"۔ چنانچہ فرشتہ نے اس کے سر کے ہاتھ پھیرا، اور اس کا گنجا پن اسی وقت دور ہو گیا، اور اس کے بال خوب صورت ہو گئے۔ اس کے بعد فرشتہ نے پوچھا "تمھیں کونسا مال سب سے زیادہ پسند ہے ؟" اس نے جواب دیا "گائے"۔ چنانچہ فرشتہ نے اسے ایک گابھن گائے دے دی، اور خیر و برکت کی دعا دیتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

آخر میں وہ اندھے کے پاس پہنچا اور اس سے وہی سوال کیا جو اس نے کوڑھی، اور گنجے سے کیا تھا۔ اندھے کو کیا چاہیے، "دو آنکھیں"۔ اس نے کہا: "میری دلی تمنا ہے کہ مجھے بینائی عطا کر دی جائے تاکہ میں دنیا کی رعنائیاں دیکھ سکوں"۔ فرشتہ نے ایک مرتبہ اس کی آنکھوں پہ ہاتھ پھیرا اور اس کی بینائی لوٹ آئی۔ پھر اس فرشتہ نے سوال کیا "تمھیں کون سا مال سب سے زیادہ پسند ہے ؟" اس نے جواب دیا "بکری"۔ چنانچہ فرشتہ نے اسے ایک عمدہ بکری دے دی۔ اور اسے دعائیں دینے کے بعد واپس چلا گیا۔

تینوں ساتھی خوش و خرم زندگی گزارنے لگے۔ اللہ نے ان کے مال میں خوب برکت دی یہاں تک کہ تینوں کے پاس اپنے اپنے جانوروں کے ریوڑ ہو گئے، تینوں

کے یہاں مال و دولت کی فراوانی ہو گئی۔

چند سال بعد حکم خداوندی سے وہی فرشتہ اپنی پہلی شکل و صورت میں آیا۔ وہ سب سے پہلے کوڑھی کے پاس پہنچا اور اس سے کہا: "میں ایک مسافر ہوں۔ میرا زادِ راہ ختم ہو گیا ہے اس لیے اس خدا کے واسطے مجھے ایک اونٹ دے دو، جس نے تمھیں یہ حسین رنگ، یہ خوب صورت جلد اور بے پناہ دولت دی ہے تاکہ میں اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ سکوں۔" مگر اس نے مسافر کو دھتکار دیا اور کہا کہ یہ سب کچھ تو مجھے ورثہ میں ملا ہے۔ میرے دست و بازو کی کمائی ہے۔ مسافر فرشتہ نے کہا: "کیا تم کوڑھی اور بدرنگ نہ تھے کہ لوگ تم سے نفرت کرتے تھے؟ کیا تم فقیر نہ تھے اور اللہ نے تم کو اپنی نعمتوں سے نوازا؟ اگر تم جھوٹے ہو تو خدا تمھیں پہلی سی حالت میں لوٹا دے۔" چنانچہ اللہ نے اس کو پھر ویسا ہی کر دیا جیسا وہ پہلے تھا۔ پھر وہ فرشتہ گنجے کے پاس پہنچا اور اس سے بھی وہی کہا جو اس نے کوڑھی سے کہا تھا۔ گنجے نے بھی اس کو وہی جواب دیا جو کوڑھی نے دیا تھا اور نتیجہ میں اللہ نے اس سے بھی نعمتیں چھین لیں اور وہ بھی سابق حالت میں آ گیا پھر وہ فرشتہ مسافر اندھے کے پاس پہنچا اور اس سے بھی وہی سوال کیا۔ جواباً اندھے نے کہا، "شکر ہے اس خدا کا جس نے مجھے میری بینائی لوٹا دی اور مجھے دولت عطا فرمائی۔ تم جتنا چاہو لے لو، سب کچھ اپنا ہی سمجھو، اگر میں اپنے بھائی ہی کے کام نہ آؤں گا تو کس کے کام آؤں گا۔ انشاء اللہ خدا مجھے اور دے گا۔" اس پر اس مسافر نے کہا، "مجھے کچھ نہیں چاہیے میں تو صرف تم تینوں کا امتحان لینے آیا تھا، تم اس میں کامیاب رہے اور تمھارے دونوں ساتھیوں کو اللہ نے پھر اسی حالت میں پہنچا دیا۔ جس میں وہ پہلے تھے اس لیے کہ انھوں نے بجائے اللہ کا شکر ادا کرنے کے احسان فراموشی کی۔ اور اسے بھول گئے، جس نے انھیں اتنی نعمتیں عطا کیں۔ اللہ تم سے خوش رہے اور تمھارے مال میں برکت عطا کرے۔" اور پھر وہ دعائیں دیتا ہوا وہاں سے چلا گیا اور وہ شخص اپنے خدا کے حضور سجدے میں گر گیا اور اس کا شکر ادا کیا۔ (مسلم)

(۳۳) بنی اسرائیل کے ایک آدمی نے بنی اسرائیل ہی کے ایک دوسرے آدمی سے ایک ہزار دینار

کا قرض طلب کیا۔

قرض دینے والا: ــــــ گواہ لے کر آؤ جنھیں میں گواہ بنا سکوں۔

قرض طلب کرنے والا: کَفٰی بِاللّٰہِ شَہِیْدًا (گواہی کے لیے اللہ کافی ہے)

قرض دینے والا: ــــــ کسی ضمانتی کو لے آؤ۔

قرض طلب کرنے والا: کَفٰی بِاللّٰہِ کَفِیْلًا (ضمانت کے لیے خدا کافی ہے.)

قرض دینے والا: ــــــ تم نے سچ کہا۔

یہ کہہ کر اس نے ایک مقررہ مدت کے لیے اس کو قرض دے دیا۔ وہ شخص قرض لے کر سمندر پار پہنچ گیا اور اپنی ضرورت پوری کر لی۔ جب ادائیگی کا وقت قریب آیا تو اس نے قرض خواہ تک پہنچنے کے لیے کشتی تلاش کی، مگر اسے کوئی کشتی وغیرہ نہ ملی۔ اب اس نے ایک لکڑی لی اور سوراخ کر کے اس میں ایک ہزار دینار رکھ دیئے اور اپنے قرض خواہ کے نام ایک خط بھی۔ پھر سوراخ بند کر کے اس لکڑی کو لے کر سمندر کے پاس آیا اور بولا:

"اے خدا! تو جانتا ہے کہ میں نے فلاں شخص سے ایک ہزار دینار لیے تھے۔ اس نے مجھ سے ضمانتی طلب کیا تھا تو میں نے کہہ دیا تھا کہ ضمانت کے لیے خدا کافی ہے۔ چنانچہ وہ تیری ضمانت پر راضی ہو گیا۔ اس نے جب مجھ سے گواہ مانگا تو میں نے کہا کہ خدا گواہی کے لیے کافی ہے تو وہ تیری گواہی پر راضی ہو گیا۔ میں نے بھرپور کوشش کی کہ مجھے کوئی کشتی وغیرہ مل جائے تاکہ میں اس تک اس کا حق پہنچا دوں لیکن میں ایسا نہ کر سکا۔ اب میں اس کی یہ رقم تیری امانت میں دیتا ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے وہ لکڑی سمندر میں ڈال دی۔ جب لکڑی سمندر میں داخل ہو گئی تو وہ لوٹ آیا اور پھر کشتی کی تلاش شروع کر دی تاکہ قرض خواہ کے پاس پہنچ سکے۔ دوسری طرف قرض خواہ یہ دیکھنے کے لیے سمندر کی طرف نکل آیا کہ شاید کشتی سے اس کی رقم آ رہی ہو (کیونکہ قرض کی ادائیگی کا یہی دن طے ہوا تھا)۔ یکایک اس کی نظر اس لکڑی پر گئی جس میں رقم رکھی ہوئی تھی۔ اس نے اس لکڑی کو اٹھا لیا تاکہ گھر میں ایندھن کا کام دے۔ چنانچہ جب اس نے لکڑی کو چیرا تو اس میں رقم اور خط موجود تھا۔

کچھ وقفہ کے بعد مقروض بھی ایک ہزار روپے لے کر آگیا۔

مقروض :۔ خدا کی قسم، میں کشتی کی تلاش میں سرگرداں رہا کہ میں آپ تک آپ کی رقم پہنچا دوں مگر جس کشتی سے میں آیا ہوں اس سے پہلے مجھے کوئی کشتی نہ مل سکی۔

قرض خواہ :۔ کیا تم نے مجھے کوئی چیز بھیجی تھی ؟

مقروض :۔ میں آپ سے کہہ رہا ہوں کہ جس کشتی سے میں آیا ہوں اس سے پہلے مجھے کشتی نہ مل سکی۔

قرض خواہ : اللہ آپ کی جانب سے وہ رقم پہنچا چکا ہے جو آپ نے لکڑی کے ذریعہ بھیجی تھی۔ اس لیے اب آپ ایک ہزار کی رقم لے کر واپس چلے جائیں۔ (بخاری)

قصہ کے ذریعہ آدمی جو بات کہنا چاہتا ہے اُسے سننے والا زیادہ دلچسپی سے سنتا ہے اور اس سے زیادہ اثر لیتا ہے اس لیے حسب موقع اچھے واقعات اور مُوثر کہانیوں سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ خاص طور پر بچوں اور کم عمر طالب علموں کی تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں قصوں سے بڑی مدد حاصل کی جا سکتی ہے اور اخلاقی اقدار کی اہمیت واضح کی جا سکتی ہے!

شگفتہ مزاجی

اگر آدمی ہر وقت منہ پھلائے رہے۔ لوگ کبھی اس کے لبوں پر تبسم، ہونٹوں پر ہنسی نہ دیکھیں تو اس کی شخصیت غیر دلچسپ ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس کے مصنوعی رکھ رکھاؤ سے لوگوں کو نفرت ہونے لگتی ہے۔ دنیا کا سب سے عظیم مربی نفسیات کے اس پہلو کو بھی ملحوظ رکھتا ہے۔ اگر تاریخ آپؐ جیسا رکھ رکھاؤ اور سنجیدگی و متانت کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے تو شگفتہ مزاجی، حسنِ ذوق، تبسم و مزاح میں بھی آپ کا کوئی ثانی نہیں پیش کر سکتی۔ مگر حد درجہ توازن اور بے نظیر اعتدال ہے آپ کی سنجیدگی اور مزاح میں، آپؐ کے تکلم اور تبسم میں۔ آپ کا تبسم عام لوگوں کی طرح محض دانتوں کو ظاہر کر دینا ہی نہیں تھا بلکہ آپؐ کے ایک تبسم سے درجنوں دل کھل اٹھتے تھے، سیکڑوں زخموں پر مرہم لگ جاتا تھا۔ آپؐ کے حسنِ ذوق اور لطافت و مزاح میں کوشش کے باوجود ابتذال کی جھلک بھی نہیں دیکھی جا سکتی۔

آپؐ نے صحابہؓ کی محفلوں کو اگر اپنے خطبوں سے گرمایا، اپنی تقریروں سے بزم کو رقت آمیز کر دیا، اپنی پرسوز نصیحتوں سے آنسوؤں اور سسکیوں کا سماں باندھ دیا تو آپؐ نے اپنی خوش مزاجی و خوش طبعی سے مجلسوں کو گلِ گلزار بنا دیا۔ اس طرح زندگی کے نشیب و فراز میں جینے کا سہارا بھی دیا اور ہر مزاح کے ذریعہ کوئی نہ کوئی حقیقت بھی ذہن نشین فرما دی۔

ایک بوڑھی عورت خدمتِ رسولؐ میں حاضر ہوئی اور عرض کیا: "اے اللہ کے رسولؐ! میرے لیے دعا کیجیے کہ خدا مجھ کو جنت نصیب فرمائے۔" آپؐ نے فرمایا: "کوئی بڑھیا جنت میں نہ جائے گی۔" بڑھیا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ واپس جانے لگی۔ آپؐ نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ تمھیں بڑھاپے کے ساتھ جنت میں نہیں لے جائے گا بلکہ وہاں بڑھیا جوان ہو کر داخلِ جنت ہوگی۔" اور یہ آیت تلاوت فرمائی:

اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً ○	ہم ان کو نئے سرے سے پیدا کریں گے۔ انھیں
فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا ○ عُرُبًا اَتْرَابًا ○	باکرہ بنائیں گے، اپنے شوہروں کو چاہنے
(الواقعہ ۳۵ تا ۳۷)	والیاں اور عمر میں ہم سن!

اس مزاح کو آپؐ نے حد سے آگے نہیں بڑھنے دیا۔ جب دیکھا کہ بڑھیا پریشان ہو رہی ہے تو آپؐ نے فوراً اسے تسلی بخش جواب دے کر اس کو مطمئن کر دیا۔ مگر اس مزاح نے ذریعہ یہ بات واضح فرما دی کہ جنت میں بوڑھے جوان ہو کر جائیں گے۔ وہاں بڑھاپے کا کوئی نام و نشان نہ ہوگا۔

ترمذی نے یہ روایت نقل کی ہے کہ آنحضورؐ کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے صدقہ کا ایک اونٹ طلب کیا تاکہ اس پر سامان لاد کر گھر لے جائے۔ آپؐ نے فرمایا: "ٹھیک ہے، میں تمھیں اونٹنی کا بچہ دیئے دیتا ہوں۔" اس آدمی نے کہا کہ "اے اللہ کے رسولؐ! میں اونٹنی کا بچہ لے کر کیا کروں گا۔" آپؐ نے فرمایا: "اونٹ بھی اونٹنی ہی کا بچہ ہوتا ہے۔"

اس مزاح کو جن لوگوں نے سنا ہوگا یقیناً وہ مسکرائے بلکہ ہنسے بغیر نہ رہ سکے ہوں گے۔ مگر آنحضورؐ کا مقصد محض ہنسنا ہنسانا نہیں تھا بلکہ اس آدمی کی ذہنی تربیت کرنا مقصود تھی۔ اس کے ذہن کو سوچنے اور غور و فکر کرنے کے لیے آمادہ کرنا تھا نتیجہ اخذ کرنے کی صلاحیت پیدا کرنا تھا۔ یہ بات واضح کر کے کہ اونٹ خواہ کتنا ہی بڑا ہو جائے، کتنے ہی بوجھوں کو لادے پھرے۔ وہ پھر بھی اونٹنی کا بچہ رہتا ہے۔ دراصل ایک کم ذہن آدمی کے لیے ذہانت کی صلاحیت پیدا کرنا تھی۔

ایسا بھی ہوتا کہ آپؐ صرف مزاح فرماتے کوئی مقصد پیشِ نظر نہ ہوتا مگر توازن و اعتدال کو ہمیشہ ملحوظ رکھتے۔ مزاح کا رنگ آٹے میں نمک کی طرح ہلکا رہتا۔ پھر آپؐ کے مزاح میں نہ تو کسی کی دل آزاری ہوتی، نہ کوئی بات خلافِ حق ہوتی۔ ایک بار حضرت

ابوہریرہؓ نے تعجب سے کہا: "کیا آپؐ بھی ہم سے مذاق فرماتے ہیں ؟"
آپؐ نے فرمایا: "ہاں! مگر میں خلافِ حق کوئی بات نہیں کہتا۔"

دراصل مذہب کے بارے میں ہمیشہ لوگوں کا تصور یہ رہا ہے کہ اس کو ماننے والوں کی صورتیں ہر وقت روہانسی ہوں اور طبیعتیں خشک ہوں۔ مگر انقلابی کارناموں کو انجام دینے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ تبسم و مزاح سے فرائضِ حیات کے بوجھ کو ہلکا کر دے مجلس میں شگفتگی کی فضا پیدا کر کے اپنے احباب کے غموں کا بوجھ ہلکا کر دے اور ان کے دلوں میں گھر کرے۔ چنانچہ راوی آپؐ کے بارے میں بیان کرتا ہے کَانَ بَسَّامًا ضَاحِکًا آپؐ بہت تبسم فرمانے والے اور ہنسنے والے تھے۔

زاہر (یا زہیر) ایک بدوی صحابی تھے۔ ان سے آپؐ کی بہت بے تکلفی تھی۔ آپؐ شہر سے متعلق کاموں میں ان کی مدد کرتے اور وہ گاؤں سے متعلق کاموں میں تعاون فرماتے۔ چنانچہ آپؐ فرماتے کہ زاہر دیہات میں ہمارا گماشتہ ہے اور شہر میں ہم اس کے گماشتے ہیں۔ ایک دن ایسا ہوا کہ زاہر بازار میں اپنا کوئی سامان بیچ رہے تھے۔ حضور اکرمؐ نے پیچھے سے جا کر چپکے سے ان کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور پوچھا بتاؤ میں کون ہوں ؟ زاہر پہلے تو سمجھ نہ سکے جب سمجھ گئے تو فرطِ محبت میں اپنے کندھے کو حضورؐ کے سینے سے ملتے رہے۔ پھر حضورؐ نے مزاحاً کہا: "اس غلام کو کون خریدتا ہے ؟" زاہرؓ نے کہا کہ "اے اللہ کے رسولؐ مجھ جیسے ناکارہ غلام کو خرید کر کون گھاٹا کمائے گا ؟" آپؐ نے فرمایا: "تم خدا کی نگاہ میں ناکارہ نہیں ہو!" (محسنِ انسانیت)

حضورؐ کے اس پاکیزہ مزاح کو دیکھئے اور غور کیجیے کہ ہمہ گیر انقلاب کی عظیم ذمہ داریاں کے ہوتے ہوئے آپؐ نے مسکراہٹوں کے لیے نقشہ زندگی میں کیسے جگہ پیدا کی ہو گی۔

ایک بار مجلس میں کھجوریں کھائی جا رہی تھیں۔ آپؐ مزاح کے طور پر اپنی کھجوروں کی گٹھلیاں نکال کر حضرت علیؓ کے سامنے ڈالتے رہے۔ آخر میں گٹھلیوں کی طرف اشارہ کر کے حضرت علیؓ سے فرمایا: "اے علی! تم تو بہت کھجوریں کھا گئے! حضرت علیؓ نے مزاح کا جواب مزاح میں دیا

"جی ہاں، مگر میں نے گٹھلیوں سمیت نہیں کھائی ہیں۔" (محسنِ انسانیت)

آنحضورؐ کا یہ مزاح کتنی کلفتوں کے لیے تریاق ثابت ہوا ہوگا۔ کتنے غم اس میں تحلیل ہو کر رہ گئے ہوں گے اس کا اندازہ اس روایت سے ہوتا ہے:

قَدْ كَانَ يُبَاسِطُ أَصْحَابَهُ بِمَا يُوْلِجُ مُحَبَّتَهُ فِي الْقُلُوْبِ (المواهب اللدنيه)۔

آپؐ اپنے رفقاء سے ایسے انداز میں مزاح فرماتے کہ رفقاء کے دل میں اپنی محبت کے بیج بو دیتے!

شدت کے بجائے نرمی

ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق تربیت پر جب غور کرتے ہیں تو احادیث سے یہ بات واضح ہو کر ہمارے سامنے آتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تعلیم و تربیت اور اصلاح و تزکیہ کے سلسلہ میں نہ شدت کی روش اختیار فرماتے تھے اور نہ ہی دوسروں کو اس کی اجازت دیتے تھے۔ آپؐ کی شخصیت لوگوں کے لیے نہایت دلکش اور محبوب تھی کیونکہ آپؐ کبھی بھی طاقت سے زیادہ ان پر بار نہیں ڈالتے تھے۔ آپؐ نے واضح الفاظ میں فرمایا:

"اپنے آپ کو اتنے ہی عمل کا مکلف بناؤ جس کی طاقت اور سکت تمھارے اندر موجود ہو۔ اس لیے کہ اللہ نہیں اکتاتا مگر تم اکتا جاؤ گے۔" (بخاری و مسلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:-

"دین آسان ہے جو شدت کا رویہ اپنائے گا وہ مغلوب ہو جائے گا اس لیے سیدھی اور میانہ روی کی راہ اپناؤ اور بشارت حاصل کرو۔" (بخاری و مسلم)

تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں نرمی و آسانی کو اختیار کرنا اور سختی سے اجتناب کرنا کتنا ضروری ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذؓ اور حضرت ابوموسیٰؓ کو یمن کی جانب روانہ فرمایا تو انھیں نصیحت فرمائی:

"نرمی کرنا۔ سختی نہ کرنا۔ خوش خبری سنانا متنفر نہ کرنا۔ مل جل کر رہنا۔ باہمی اختلاف سے بچنا۔" (بخاری و مسلم)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس بات کا اہتمام فرماتے کہ اسلامی تعلیمات کو آسان سے

آسان تر بنا کر پیش کیا جائے تاکہ صحابہ کرامؓ نہایت خندہ پیشانی سے ان تعلیمات کو اپنا سکیں اور اپنی زندگی میں انھیں عملی جامہ پہنا سکیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

إِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی یُحِبُّ أَنْ تُؤْتٰی رُخْصَتُهٗ كَمَا یَكْرَهُ أَنْ تُؤْتٰی مَعْصِیَتُهٗ (الصحوة الاسلامیة)

جس طرح اللہ تعالیٰ کو یہ بات ناپسند ہے کہ اس کی نافرمانی کی جائے اسی طرح یہ اس کے نزدیک پسندیدہ امر ہے کہ اس کی دی ہوئی رخصت سے فائدہ اٹھایا جائے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ذاتی طور پر بہت لمبی نماز پڑھتے۔ یہاں تک کہ جب رات کو تہجد کی نماز پڑھتے تو اتنا طویل قیام فرماتے کہ آپ کے پاؤں پر ورم آ جاتا لیکن جب آپ امام ہوتے تو لوگوں کی سہولت اور آسانی کے پیش نظر ہلکی نماز پڑھاتے۔ آپؐ کا ارشاد ہے:

إِذَا صَلّٰی أَحَدُكُمْ بِالنَّاسِ فَلْيُخَفِّفْ فَإِنَّ فِيهِمُ الضَّعِيفَ وَالسَّقِيمَ وَالْكَبِيرَ وَإِذَا صَلّٰی أَحَدُكُمْ بِنَفْسِهٖ فَلْيُطَوِّلْ مَا يَشَاءُ (بخاری)

جب تم میں سے کوئی امام ہو تو اسے ہلکی نماز پڑھانا چاہیے کیوں کہ مقتدیوں میں کمزور، بیمار اور بوڑھے بھی ہوتے ہیں اور جب تم میں سے کوئی تنہا نماز پڑھے تو حسب خواہش اپنی نماز کو طویل کر سکتا ہے۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

إِنِّي لَأَدْخُلُ فِي الصَّلٰوةِ وَأَنَا أُرِيدُ إِطَالَتَهَا فَأَسْمَعُ بُكَاءَ الصَّبِيِّ فَأَتَجَوَّزُ فِي صَلٰوتِي مِمَّا أَعْلَمُ مِنْ شِدَّةِ وَجْدِ أُمِّهٖ مِنْ بُكَائِهٖ۔ (بخاری)

میں نماز شروع کرتا ہوں اور اسے لمبی کرنا چاہتا ہوں، اتنے میں بچہ کے رونے کی آواز سنتا ہوں تو اپنی نماز مختصر کر دیتا ہوں۔ کیوں کہ بچہ کے رونے کی وجہ سے اس کی ماں کے اندر جو بیقراری کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اس کو میں جانتا ہوں۔

اپنے رفقار کے ساتھ نرمی اور آسانی کا رویہ اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ آپؐ کی یہی وہ روش تھی جس کی وجہ سے صحابہ کرامؓ آپؐ پر فریفتہ تھے۔ آپ پر جان چھڑکنا وہ اپنی سعادت سمجھتے تھے۔ آپ کی زبان سے نکلنے والے الفاظ کو ادا ہونے سے پہلے ہی عملی جامہ پہنانے کے لیے تیار رہتے تھے۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نرمی و آسانی کے بجائے شدت و سختی کا رویہ اپناتے یا اپنی بات قوت و زور سے منوانے کی کوشش کرتے تو صحابہؓ کا جھرمٹ وسیع سے وسیع تر ہونے کے بجائے دن بدن گھٹتا چلا جاتا اور آپؐ یکہ و تنہا رہ جاتے۔ خود قرآنِ پاک اس کی گواہی ان الفاظ میں دیتا ہے:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ (آل عمران: ۱۵۹)

(اے پیغمبر) یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان کے لیے نرم مزاج واقع ہوئے، ورنہ اگر تم تندمزاج اور سخت دل ہوتے تو یہ تمھارے گرد و پیش سے چھٹ جاتے

رسول خداؐ کی پوری زندگی اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ آپؐ نے صرف دو موقعوں پر سختی کو اختیار کیا ہے۔ جنگ کے موقع پر یا مجرموں پر شرعی حدود نافذ کرتے وقت ورنہ اصلاح و تربیت، دعوت و تبلیغ کے سلسلہ میں آپ ہمیشہ نرمی و آسانی اور محبت و رأفت کو اختیار فرماتے اور اس بات کی کوشش کرتے کہ اسلام پر عمل کرنا تمام لوگوں کے لیے آسان ہو جائے۔ آپؐ نے کبھی بھی کسی ایسے کام کی ہدایت نہیں کی جو لوگوں کے لیے ناقابل عمل ہو یا جس کے کرنے کی ان میں سکت نہ ہو۔ آپؐ کا اسلوب اور طریقہ ہمیشہ آسانی اور نرمی کا ہوتا۔ اگر کبھی زجر و ترہیب کی ضرورت پڑتی تو اس میں بھی مخاطبین محبت و شفقت کی جھلک محسوس کرتے۔ چنانچہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

مَا دَخَلَ الرِّفْقُ فِيْ شَيْءٍ اِلَّا زَانَهُ وَلَا دَخَلَ الْعُنْفُ فِيْ شَيْءٍ اِلَّا شَانَهُ۔ (الصحوۃ الاسلامیۃ)

جس چیز میں نرمی برتی جاتی ہے تو نرمی اسے خوب صورت بنا دیتی ہے اور جس چیز میں سختی برتی جاتی ہے تو سختی اسے عیب دار بنا دیتی ہے۔

ایک بار ایک دیہاتی نے مسجد میں پیشاب کر دیا۔ لوگ اس کو روکنے کے لیے اس کی طرف بڑھنے لگے۔ آپؐ نے فرمایا: "اسے چھوڑ دو، اور ایک ڈول پانی لا کر بہا دو۔ تمھیں آسانی پیدا کرنے کے لیے بپا کیا گیا ہے سختی کے لیے نہیں۔" (بخاری)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نرمی و آسانی اختیار کر کے اور نرمی و آسانی کی تعلیم دے کر اپنے اصحابؓ کی سیرتوں کو لطف و مرحمت، نرمی و رفاقت کا اعلیٰ نمونہ بنا دیا تھا۔ آپؐ کی اس حکمتِ عملی کا یہ نتیجہ تھا کہ کوئی شخص بھی اسلام قبول کرنے کے بعد اسلام کے دائرہ سے باہر آنا اپنے لیے گوارا نہ کرتا تھا۔

غلو سے اجتناب اور اعتدال پسندی

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اصلاح وتربیت کے سلسلہ میں نہایت اعتدال پسندانہ روش اختیار فرماتے اور انتہا پسندی سے اجتناب فرماتے۔ خود بھی اس کا اہتمام کرتے اور صحابہ کرامؓ کو بھی اس پر آمادہ فرماتے۔ یہ حقیقت ہے کہ کوئی بھی تحریک "غلو" اختیار کر کے کامیابی حاصل نہیں کر سکتی۔ غلو انسانی فطرت سے میل نہیں کھاتا اس لیے یہ عموماً لوگوں کے لیے ناقابل برداشت ہوتا ہے۔ اگر کچھ لوگ وقتی طور پر "غلو" کو اختیار بھی کر لیں، تو وہ زیادہ دیر اس پر قائم نہیں رہ سکتے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ کسی شخص نے کسی کام یا عبادت میں غلو کو اختیار کیا مگر چند دن کے بعد سرد مہری کا شکار ہو گیا اور فرائض کی ادائیگی سے بھی کترانے لگا۔ چنانچہ نبی کریمؐ نے فرمایا:

"بے شک اللہ کے نزدیک سب سے بہتر عمل وہ ہے جس پر مداومت برتی جائے چاہے وہ تھوڑا ہی کیوں نہ ہو!" (بخاری ومسلم)

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ "آنحضرتؐ کے پاس ایک باندی تھی وہ دن میں روزہ رکھتی اور راتوں کو نماز پڑھتی۔ جب آنحضورؐ کو اس بات کا علم ہوا تو آپؐ نے فرمایا ہر کام میں تیزی اور سرگرمی کی کیفیت ہوتی ہے پھر اس میں ڈھیل اور سستی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے پس جس کی ڈھیل کا رخ میانہ روی کی طرف ہو تو وہ بہت خوب اور بہتر ہے لیکن جس کی ڈھیل کا رخ معصیت کی طرف ہوتا ہے تو وہ ہلاک ہونے والے ہیں۔" (طبرانی)

نبی کریمؐ نے صاف صاف الفاظ میں ہدایت فرمائی:

إِيَّاكُمْ وَالْغُلُوَّ فِي الدِّينِ فَإِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ بِالْغُلُوِّ فِي الدِّينِ۔ (مسند احمد)

تم دین میں غلو کرنے سے بچو کیونکہ تم سے پہلے لوگ دین میں غلو کرنے کی وجہ سے ہلاک ہو گئے۔

صحیح مسلم میں ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ آنحضورؐ نے فرمایا هَلَكَ الْمُتَنَطِّعُوْنَ یہ جملہ آپؐ نے تین بار فرمایا۔ امام نوویؒ نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ "اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو بال کی کھال نکالتے ہیں، انتہاپسندی کا رویہ اپناتے ہیں اور اپنے اقوال وافعال میں حد سے تجاوز کرتے ہیں۔"

ایک بار کچھ لوگ ازواجِ مطہرات کے پاس آئے اور ان سے دریافت کیا کہ رسول اللہؐ گھر کی تنہائیوں میں کیا کرتے ہیں؟ جب ازواج مطہرات نے آنحضورؐ کی گھریلو مصروفیتوں کے بارے میں بتایا تو ان لوگوں نے آنحضور کے عمل کو دینی لحاظ سے کم سمجھا۔ چنانچہ ان میں سے ایک نے کہا "میں کبھی گوشت نہیں کھاؤں گا۔" ایک نے کہا۔ "میں کبھی شادی نہیں کروں گا۔" ایک نے کہا "میں کبھی بستر پر نہیں سوؤں گا۔" جب آنحضورؐ کو ان کی یہ بات معلوم ہوئی تو آپؐ نے فرمایا: "لوگوں کو کیا ہوگیا ہے کہ وہ ایسی ایسی باتیں کہتے ہیں حالانکہ میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، رات میں سوتا ہوں اور نماز کے لیے کھڑا بھی ہوتا ہوں۔ نیز میں گوشت بھی کھاتا ہوں اور شادیاں بھی کرتا ہوں۔ پس جو شخص میری سنت کو پسند نہیں کرتا وہ مجھ میں سے نہیں ہے۔"

(بخاری ومسلم)

معلمین ومربین کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ کسی بھی مرحلہ میں اپنے زیرِ تربیت افراد کو کسی بھی پہلو سے غلو اور انتہاپسندی کی طرف نہ جانے دیں۔ غور وفکر، معاملہ وبرتاؤ، قول وقرار، عمل وکارکردگی، دعوت وتبلیغ غرض کہ ہر محاذ پر اعتدال وتوازن کا عادی بنائیں۔ خود بھی غلو کے رویہ سے بچیں اور دوسروں میں بھی اس کی آمیزش نہ ہونے دیں۔ کیوں کہ غلو لوگوں میں وحشت وتنفر پیدا کرتا ہے۔ لوگ فطری طور پر اس کو برداشت نہیں کرسکتے اور اگر اس کو برداشت بھی کرلیں تو زیادہ دنوں تک گاڑی نہیں چل پاتی بلکہ وہ اکتاہٹ کا شکار ہوکر فرائض تک سے دور ہوجاتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ کوئی یکبارگی اٹھتا ہے اور نوافل کا اس قدر اہتمام کرتا ہے کہ نہ راتوں کو سوتا ہے اور نہ ہی دن میں کسی مستحب نفل کو چھوڑتا ہے جب دیکھیے نماز پڑھتے دکھائی دیتا ہے مگر یہ کیفیت زیادہ دنوں تک برقرار نہیں رہ پاتی بلکہ

جب وہ اکتاہٹ کا شکار ہوتا ہے تو نوافل تو درکنار وہ فرض نمازوں میں بھی سستی کرنے لگتا ہے۔ چونکہ دین اسلام پوری زندگی اور تمام انسانوں کے لیے ہے اس لیے اسلام نے اپنے مزاج میں کسی بھی طرح کے غلو اور تشدد کی کوئی گنجائش نہیں رکھی۔ اسلام لوگوں کے لیے بار نہیں بلکہ سکون و راحت کا سبب ہے۔ اس نقطۂ نظر کو نبی کریمؐ اپنے اصحابؓ کی تربیت کے سلسلہ میں ہر وقت ملحوظ رکھتے تھے۔ جب بھی آپ کو معلوم ہوتا کہ کہیں پر اعتدال سے تجاوز ہو رہا ہے تو آپ اس پہ بند لگاتے۔ ایک بار حضرت معاذ بن جبلؓ نے لوگوں کو نماز پڑھاتے وقت لمبی قرأت کی۔ کسی نمازی نے آنحضورؐ سے آکر شکایت کر دی۔ آنحضورؐ نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو مخاطب کر کے فرمایا:

"اے معاذ! تم لوگوں کو آزمائش میں ڈال دیتے ہو۔" آپؐ نے ناپسندیدگی کے لیے ان کلمات کو تین بار دہرایا۔ (بخاری)

جب زندگی کے کسی پہلو میں غلو کی روش اختیار کی جاتی ہے تو زندگی کے دوسرے پہلو اس سے متاثر ہوتے ہیں اور بہت سے حقوق اور ذمہ داریوں کی ادائیگی میں کوتاہی بھی ہوتی ہے۔ اگر اسراف ہوگا تو لازماً دوسری طرف کسی کی حق تلفی ہوگی۔ اگر عبادت میں حد سے زیادہ شغف ہوگا تو حقوق العباد کی ادائیگی میں کوتاہی بھی ہوگی۔ چنانچہ نبی کریمؐ تک جب یہ خبر پہنچی کہ عبداللہ بن عمروؓ عبادت میں اتنے مشغول ہو گئے ہیں کہ گھر والوں کے حقوق بھی بھول گئے ہیں تو آپؐ نے ان سے کہا تم دن میں روزے رکھتے ہو اور رات میں نمازیں پڑھتے ہو؟

حضرت عبداللہ نے عرض کیا۔ "ہاں! یا رسول اللہؐ۔"

یہ سن کر آپؐ نے فرمایا: "ایسا نہ کرو! روزہ بھی رکھو اور افطار بھی کرو۔ سوؤ بھی اور جاگو بھی، اس لیے کہ تمھارے جسم کا تم پر حق ہے، تمھاری آنکھوں کا تم پر حق ہے، تمھاری بیوی کا تم پر حق ہے اور جو لوگ تم سے ملنے آتے ہیں ان کا بھی تم پر حق ہے۔" (بخاری)

غرض نبی کریمؐ نے غلو و انتہا پسندی سے اجتناب کر کے راہِ اعتدال پر چل کر اور لوگوں کو راہِ اعتدال پر چلنے کی تلقین کر کے صحابہ کرامؓ کے مزاج کو اعتدال پسند اور میانہ رو بنا دیا تھا۔

تدریج وترتیب

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دعوت وتربیت کے سلسلہ میں تدریج کا اہتمام فرماتے تھے کسی بھی مخاطب پر ہدایات کو یکبارگی نہ لادتے بلکہ اپنے مخاطب کی صلاحیت اور طاقت کے مطابق اسے تھوڑے تھوڑے احکام کا پابند بناتے۔ واقعہ یہ ہے کہ تعلیم وتربیت کے سلسلہ میں تدریج ایک فطری اور ضروری چیز ہے۔ اگر تدریج کا خیال نہ رکھا جائے تو اصلاح وتربیت کا کام کیا ہی نہیں جاسکتا۔ زیر تربیت افراد کی خوبیوں اور خامیوں کا اچھی طرح تجزیہ کرکے ایک ایک خامی کو دور کرنا چاہیئے اور ایک ایک خوبی کو پروان چڑھانا چاہیئے۔ اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ کسی کی تمام خامیاں یک لخت ختم ہوجائیں تو یہ خام خیالی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کا نزول ۲۳ سالوں کے درمیان جستہ جستہ ہوا۔ اسی طرح سے اسلامی احکام وتعلیمات کا نفاذ یک لخت نہیں کیا گیا بلکہ تدریج وترتیب کو پیش نظر رکھا گیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ صحابہ کرام رضؓ میں جو کردار پروان چڑھا اس کی مثال کسی دوسری تحریک میں نہیں ملتی۔

آنحضورؐ تدریج کا کس درجہ خیال رکھتے تھے اس کا اندازہ اس نصیحت سے بخوبی ہوجاتا ہے جو آنحضورؐ نے حضرت معاذ بن جبل رضؓ کو یمن روانہ کرتے ہوئے کی تھی۔ آپؐ نے فرمایا:

"تم ایک ایسی قوم کی طرف جارہے ہو جو اہل کتاب ہے۔ تم پہلے انھیں توحید اور رسالت کی دعوت دینا۔ جب وہ یہ بات مان لیں کہ اللہ ایک ہے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے رسول ہیں تو پھر انھیں یہ بتانا کہ خدا نے دن رات میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔ جب وہ یہ بات تسلیم کرلیں تو پھر انھیں یہ بتانا کہ خدا نے ان پر زکوٰۃ فرض کی ہے جو مالداروں سے لی جائے گی اور غریبوں کی ضروریات پر خرچ کی جائے گی۔"

دیکھا آپ نے ؟ نبی کریمؐ نے دعوت و تربیت کے سلسلہ میں حضرت معاذؓ کو کس طرح تدریج کا حکم دیا کہ وہ اپنی دعوت کا آغاز اسلام کی بنیادی تعلیم سے کریں۔ لوگوں کو پہلے توحید اور رسالتِ محمدیؐ کی تعلیم دیں ـــــ جب وہ اس بنیادی اصول کو تسلیم کرلیں تو پھر انھیں اسلام کے دوسرے رکن نماز کی طرف بلائیں۔ جب وہ نماز کے سلسلے میں بھی مطیع ہو جائیں تب انھیں اسلام کے تیسرے رکن زکوٰۃ سے آگاہ کیا جائے اور اس طرح تدریج کے ساتھ پورا اسلام ان کے سامنے پیش کر دیا جائے۔

آج کل دیکھا گیا ہے کہ دعوت و اصلاح کا کام کرنے والے لوگ پہلے ہی مرحلہ میں مکمل تبدیلی اور انقلاب کی دعوت دے بیٹھتے ہیں اور بہت سے مربی اپنے مخاطبین سے پہلے ہی مرحلہ میں یک لخت تبدیلی کا مطالبہ کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اسلامی عقائد کو تسلیم کرتے ہی اور تمام فرائض ادا کرنے اور محرمات سے بچنے کے ساتھ نوافل کا اہتمام بھی کریں۔ مکروہات و مباحات سے بھی بچیں بلکہ بعض لوگ فروع اور جزئیات پر زیادہ زور دیتے ہیں اور اصول و مبادی کو نظر انداز کر دیتے ہیں مثلاً کوٹ اور پتلون کے ترک پر بڑا زور دیتے ہیں اور حقوق العباد کی ادائیگی کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ تدریج میں جہاں یہ بات شامل ہے کہ تمام چیزوں کی یکبارگی تلقین نہیں کرنا چاہیئے وہیں یہ بات بھی شامل ہے کہ درجات و مراتب کا بھی خیال رکھا جائے ۔ جو سب سے اہم بات ہے پہلے اس کی طرف توجہ دلائی جائے پھر جو اس سے کم ہو اس کی طرف توجہ مبذول کرائی جائے۔ یعنی الاول فالاول کا خیال رکھا جائے۔

تدریج کے اس پہلو کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں:

"قرآن پاک میں پہلے پہل صرف وہ سورتیں نازل ہوئیں جن میں جنت اور جہنم کا ذکر ہے۔ یہاں تک کہ جب لوگ اسلام کے سائے میں آگئے تو حرام اور حلال کی آیتیں نازل ہوئیں اور اگر پہلے ہی مرحلہ میں وہ آیات نازل ہو جاتیں جن میں شراب اور زنا کو حرام قرار دیا گیا ہے تو لوگ پکار اٹھتے: ہم شراب اور زنا کو کبھی نہیں چھوڑیں گے۔" (بخاری)

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جو لوگ احیائے اسلام کی کوشش کر رہے ہیں ان کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے نصب العین اور منزلِ مقصود تک پہنچنے کے سلسلہ میں تدریج کے قانون کو نگاہوں کے سامنے رکھیں اور درمیانی منازل سے اعراض نہ کریں۔

تدریج کا یہ قانون فطری ہے اور تمام مخلوقات میں پایا جاتا ہے۔ انسان، حیوانات اور نباتات میں سے ہر وجود تدریجی مراحل سے گذر کر اپنے کمال کو پہنچتا ہے۔ پھر اصلاح و تربیت جو گوناگوں نزاکتوں کو لیے ہوئے ایک عظیم فریضہ ہے، بغیر تدریج کے کس طرح مؤثر ہو سکتی ہے؟

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے جب خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالیں اور زندگی کے قافلے کو خلفاء راشدین کی راہ پر لگانے کا ارادہ کیا تو ان کے غیور و پرجوش بیٹے عبدالملک نے جب یہ دیکھا کہ غلطیوں کی اصلاح کرنے اور مظالم کو رفع کرنے میں تاخیر ہو رہی ہے تو ایک روز اپنے والد عمر بن عبدالعزیزؒ سے کہا:

"آپ سارے معاملات کو جلد از جلد درست کیوں نہیں کر دیتے۔ حق کی راہ میں ہمیں جو کچھ بھی پیش آئے اس کی ہمیں کوئی پرواہ نہیں کرنا چاہیئے۔"

یہ سن کر مدبر باپ نے جواب دیا:

"بیٹے جلدی نہ کرو، اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں شراب کی مذمت میں دو بار آیتیں نازل کیں۔ پھر تیسری بار آیات نازل کر کے شراب کو حرام قرار دیا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اگر میں تدریج کو نظر انداز کر کے یکبارگی لوگوں کو پورے حق پر آمادہ کرنے کی کوشش کروں تو کہیں لوگ اسے چھوڑ نہ دیں تو یہ بھی بڑا فتنہ ہو گا۔ (الموافقات)

اصلاح و تربیت کے سلسلہ میں تدریج کی بڑی اہمیت ہے ایک طرف انسانی تجربات یہ ثابت کرتے ہیں کہ تدریج ایک فطری عمل ہے دوسری طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ بھی اس کی وضاحت کرتا ہے اور آپ کی پوری حیات دعوت و تربیت تدریج کے حسن سے روشن ہے!

رجائیت پسندی

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اصلاح و تربیت، دعوت و تبلیغ کے سلسلہ میں یأس و قنوطیت کے بجائے امید و رجا کو اہمیت دیتے تھے۔ اپنے اصحابؓ کی حوصلہ افزائی فرماتے، اُن کی ہمت بندھاتے اور سخت سے سخت حالات میں بھی روشن پہلو کو اجاگر کرتے۔

ایک بار حضرت خبابؓ بن الارتؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا:

"اے اللہ کے رسولؐ! راہِ اسلام میں ہمیں ستایا جا رہا ہے، شدید ترین ایذائیں پہنچائی جا رہی ہیں کیا آپؐ ہمارے لیے دعائیں نہیں کریں گے، کیا آپؐ ہمارے لیے اللہ سے مدد طلب نہیں کریں گے؟

اُن کی یہ شکایت سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تم سے پہلے ایسے لوگ گزرے ہیں جن کی ہڈیوں سے گوشت اور پٹھوں کو لوہے کی کنگھیوں سے چھیل دیا گیا۔ ان میں سے کسی کے آری سے دو ٹکڑے کر دیئے گئے۔ وہ ان تکلیفوں کو برداشت کرتے تھے لیکن اپنے دین سے منحرف نہیں ہوتے تھے۔ اللہ اس دین کو ضرور غالب کرے گا۔ یہاں تک کہ سوار صنعا سے حضرموت تک سفر کرے گا لیکن اسے راستہ میں خدا کے سوا کسی کا خوف نہ ہو گا! البتہ اپنی بھیڑ بکریوں پر بھیڑیوں کا اندیشہ ہو گا۔ یہ سب کچھ ہو کر رہے گا۔ لیکن تم لوگ جلد بازی کر رہے ہو!" (ریاض الصالحین)

مکہ کے پر آشوب حالات کا تصور کیجیے۔ جہاں صحابہ کرامؓ پر مصائب و آلام کے پہاڑ ڈھائے جا رہے تھے۔ ان کربناک حالات میں جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی جاتی ہے تو پہلے آپ انبیاء علیہم السلام اور ان کے ماننے والوں پر کیے گئے مظالم کا تذکرہ کر کے صحابہؓ کی ڈھارس بندھاتے ہیں اور مستقبل میں کامیابی و کامرانی کا

مژدہ سناتے ہیں!

غور کیجیے، جب حالات اس قدر ناسازگار تھے کہ اسلام قبول کرنا اژدہے کے منہ میں ہاتھ دینے کے مترادف تھا؛ جب اسلام مظلومیت وبے بسی کا دوسرا نام تھا؛ جب ہر مسلمان استہزاد تمسخر کا نشانہ اور ابتلا و آزمائش کا تختۂ مشق بنا ہوا تھا ان تاریک ترین حالات میں بھی رسولِ خدا ﷺ اسلام کی رفعت وسربلندی اور اسلامی نظام کے نفاذ کی خوشخبری سنا رہے تھے۔

آج ہم حالات کی ناسازگاری سے بددل اور مایوس ہو جاتے ہیں۔ روشن مستقبل کے سلسلے میں ہمارے اندر کوئی امنگ نہیں پائی جاتی۔ حالات کی ناسازگاری کا شکوہ کر کے ہمت ہار کر بیٹھ جاتے ہیں جن افراد کی تربیت کی ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے ہم خود حالات کی پرآشوبی کی منظرکشی کر کے ان کے حوصلوں کو پست کر دیتے ہیں۔ انھیں اقتدارِ وقت کے سخت رویہ کے اندیشوں میں مبتلا کر کے ان کے حوصلوں کو پست کر دیتے ہیں۔ انھیں اقتدارِ وقت کے سخت رویہ کے اندیشوں میں مبتلا کر کے پست ہمت بنا دیتے ہیں۔ حالاں کہ رسولِ خدا کا اسوہ ہمارے سامنے موجود ہے کہ آپ ﷺ نے تاریک سے تاریک حالات میں بھی امید و رجا کی تعلیم دی۔ مظلومی وبے بسی کے عالم میں بھی ہمت افزائی کی باتیں کیں اور اپنے اصحابؓ کے حوصلوں کو بلند کیا۔

یقیناً آج اسلام اور مسلمان طرح طرح کے مسائل سے دوچار ہیں۔ منکرات پھیل رہے ہیں اور نیکیاں دب رہی ہیں شیطان اور اس کے چیلے آزادانہ اپنی طاغوتی سرگرمیوں میں مصروف ہیں اور بندگانِ خدا کے لیے راہیں مسدود کی جا رہی ہیں۔ بگاڑ اور کرپشن نے پورے انسانی سماج کو اپنے حصار میں لے لیا ہے۔ کمیونزم الحاد و دہریت کے سرسبز باغ دکھا کر ہماری نسلوں کو گمراہ کر رہا ہے، سیکولرزم پورے زور وشور سے لادینیت کو فروغ دے رہا ہے۔ عیسائی مشنریاں ہمارے نونہالوں کو ہم سے اچک لینا چاہتی ہیں۔ ذرائع ابلاغ عریانیت وفحاشی کے لیے وقف ہو کر رہ گئے ہیں۔ بے شرمی و بے حیائی اپنے عروج پر پہنچ چکی ہے۔ فحش لٹریچر اور عریاں فلموں نے رہی سہی کسر پوری کر دی ہے اور پورا انسانی سماج بداخلاقی اور بے راہ روی

کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ لیکن پھر بھی مایوسی وناامیدی کی کوئی وجہ نہیں۔ اگر خلوص اور کامیابی کے عزم کے ساتھ دعوت وتبلیغ اور اصلاح وتربیت کا کام کیا جائے تو میدان اہلِ حق کے ہاتھوں ہی رہے گا! حوصلوں کو بلند رکھتے ہوئے عزیمت کے ساتھ راہِ حق پر گامزن رہا جائے تو خدا کی نصرت و مدد ضرور آئے گی۔

موجودہ حالات کا ذرا تقابل کیجیے۔ ان حالات سے جب اللہ کا رسولؐ بے بسی کے عالم میں اپنے وطن کو خیر آباد کہہ رہا تھا، مکہ کی ان وادیوں کو الوداع کہہ رہا تھا جہاں اس نے زندگی کے ۵۳ سال گزارے تھے۔ ان گلیوں کو رخصت کر رہا تھا جہاں اس نے صبح وشام بسر کیے تھے۔ اپنے پیارے وطن کو چھوڑتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے اور اس نے کعبۃ اللہ سے مخاطب ہو کر کہا تھا:

"خدا کی قسم تو مجھے بہت عزیز ہے اگر میرے وطن کے لوگ مجھے مجبور نہ کرتے تو میں تجھے کبھی چھوڑ کر نہ جاتا۔"

کتنے سخت حالات رہے ہوں گے جب اللہ کا رسولؐ اور اس کے ساتھی اپنے کاروبار گھر بار، خاندان ورشتہ دار اور اپنے وطن کو چھوڑ کر مدینہ کی جانب ہجرت کر رہے تھے۔ کیا مظلومیت وبے بسی کی اس سے بھی زیادہ کوئی حد ہو سکتی ہے۔ مگر دیکھیے، جب اسی سفر ہجرت میں سراقہ بن جعشم انعام کے لالچ میں آپؐ کا تعاقب کرتا ہے۔ وہ فال نکالتا ہے۔ فال نفی میں نکلتی ہے مگر انعام کا لالچ آج آبائی رسوم کی بیڑیوں کو کاٹ ڈالتا ہے۔ گھوڑے کو کئی بار ٹھوکر لگتی ہے۔ وہ ہر بار ٹھٹھکتا ہے، سوچتا ہے، مگر انعام کا لالچ ہر بار اسے تعاقب کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ جب وہ تعاقب کرتے کرتے بہت قریب پہنچ جاتا ہے تو اس کے گھوڑے کے پیر گھٹنوں تک زمین میں دھنس جاتے ہیں۔ اس کی عقل پر پڑا ہوا پردہ اٹھ جاتا ہے اور وہ پکار اٹھتا ہے "اے اللہ کے رسولؐ! مجھے امان لکھ دیجیے۔"

زبانِ رسالت مآبؐ سے بیساختہ یہ الفاظ نکلتے ہیں:

"اے سراقہ بن جعشم! میں تمہارے ہاتھ میں کسریٰ کے کنگن دیکھ رہا ہوں۔"

غور کیجیے، حالات مظلومی وبے بسی کی آخری حد کو چھو رہے ہیں مگر اللہ کے رسولؐ

کی پُر امید نظریں وقت کی سب سے بڑی طاقت کو مفتوح اور اسلام کو فاتح کی حیثیت سے دیکھ رہی ہیں، نگاہ عزیمت کی یہ شان کہ کسریٰ کے کنگن ایک خانہ بدوش بدو کے ہاتھوں میں نظر آرہے ہیں۔

یہ ہے وہ رجائیت جس کی بنیاد پر تحریکیں وجود میں آتی ہیں؛ آگے بڑھتی ہیں اور اپنی منزل کو پالیتی ہیں۔

ایک بار کلید بردار کعبہ عثمان بن طلحہ سے حضورؐ نے کعبہ کا دروازہ کھولنے کے لیے کہا تو اس نے انکار کر دیا۔ غور کیجیے مکی دور میں حالات کتنے سخت اور ناسازگار تھے مگر آپؐ نے ان تاریک ترین حالات میں شمعِ امید کو ان الفاظ سے فروزاں کیا: "ایک دن آنے والا ہے جب یہ کنجی ہمارے ہاتھ میں ہوگی اور ہم جسے چاہیں گے اس کے حوالے کر دیں گے۔" (المواہب اللدنیہ)

آیئے غزوۂ خندق کے واقعہ پر بھی غور کرتے چلیں۔ اسلام دشمن طاقتوں نے متحدہ محاذ بنا کر اسلام اور مسلمانوں کو ختم کر دینے کا منصوبہ بنایا۔ تمام عرب قبائل اور یہودی طاقتوں نے مجتمع ہو کر مدینہ پر حملہ کی تیاری مکمل کر لی۔ ذرا غور کیجیے مخالفین کا ٹڈی دل لشکر، خندق کی کھدائی کا مرحلہ، رفقاء کی قلت، بے سروسامانی کی انتہا، فاقہ کشی کا عالم، منافقین کے ہمت شکن عذرات، مدینہ میں یہودیوں کی سازشوں کے اندیشے، انسانی حوصلوں کو دبا دینے والی اس پیچیدہ صورتِ حال میں اللہ کا رسولؐ اپنے اصحاب کے ساتھ خندق کھودنے میں منہمک ہے مگر پھر بھی مایوسی و ناامیدی کا دور دور تک کوئی نشان نہیں۔ رسولِ خدا کی عزیمت و ہمت، نشاط و شگفتگی اور بلند ہمتی و بلند حوصلگی، صحابہ کرامؓ کے لیے مہمیز کا کام کر رہی ہے۔ خندق کی کھدائی کے دوران کچھ سخت چٹانیں صحابہ کرامؓ سے نہیں ٹوٹ پائیں۔ رسولِ خدا کدال سنبھال کر ضرب لگاتے ہیں۔ پہلی ضرب لگا کر فرمایا کہ یمن میرے لیے فتح ہو گیا، دوسری ضرب لگا کر فرمایا شام اور المغرب میرے لیے سرنگوں ہو گئے۔ تیسری ضرب لگا کر فرمایا خطۂ مشرق (ایران) فتح ہو گیا۔ (محسنِ انسانیت)

غور کیجیے انتہائی ناسازگار حالات میں اللہ کے رسولؐ عظیم ملکوں اور شہروں کی فتح کی بشارت اپنے اصحابؓ کو سنا رہے ہیں۔ جن ناگفتہ بہ حالات میں بظاہر اپنا دفاع بھی مشکل نظر آتا

ہے وہاں رسول خدا کی نظر دور رس، اور نگاہ رجائیت ایران و شام کو فتح ہوتے ہوئے دیکھ رہی ہے۔ رجائیت کا یہی وہ پہلو تھا جو مکہ سے لے کر مدینہ تک اصحاب رسولؐ کو نیا حوصلہ اور نئی امنگ دیتا رہا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رجائیت کا یہ نعرہ کہ اسلام کے سامنے عرب و عجم مفتوح ہوں گے تحریک اسلامی کا سلوگن ہے!

تعلیم و تربیت اور دعوت و تبلیغ کے سلسلہ میں امید و رجا کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑنا چاہیئے۔ حالات کتنے بھی ناسازگار ہوں، مایوسی و بددلی کا شکار نہ ہونا چاہیئے۔ بلکہ بلند حوصلگی اور عزم و یقین کی قوت کے ساتھ اپنے کام کو جاری رکھنا چاہیئے۔ جب تحریکیں رجاء و امید کا دامن تھامے بلند حوصلگی سے منزل کی طرف بڑھتی ہیں تو منزل خود ان سے قریب ہونے لگتی ہے اور جب کوئی تحریک مایوسی کا شکار ہو جاتی ہے تو اس کی منزل اس قدر دور ہو جاتی ہے کہ اسے پا لینا ناممکن ہو جاتا ہے۔

حسنِ ظن اور چشم پوشی

اپنے ساتھیوں کے ساتھ حسنِ ظن رکھنا ان کی لغزشوں کی تاویل کر لینا، معمولی معمولی کوتاہیوں کو نظر انداز کر دینا کسی بھی جماعت یا تحریک کے لیے ضروری ہے۔ کسی کی تربیت اس وقت تک ناممکن ہے جب تک اس کے ساتھ حسنِ ظن اور خوش گمانی سے کام نہ لیا جائے۔ سوءِ ظن کے ساتھ نہ کبھی کوئی کام ہوا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ سیرت اور کردار کی تعمیر جیسے عظیم کام کے لیے ضروری ہے کہ اپنے زیرِ تربیت افراد کے سلسلے میں ہر قسم کی بدگمانی سے بچا جائے۔ جب تک واضح طور پر کوئی بات سامنے نہ آ جائے اس وقت تک بدگمانی کے ذرا سے شائبہ کو بھی شامل ہونے کی اجازت نہ دی جائے اور اگر غلطی واضح ہو کر سامنے آ جائے تو حتی الامکان حسنِ ظن سے کام لے کر، خوب صورت تاویل کر کے اسے نظر انداز کر دیا جائے۔ ایک مربی کی نگاہ اگر کسی کی کوتاہی کی جانب اٹھے تو اس طرح سے اٹھے جیسے ایک طبیب کی نگاہ کسی بیمار کی طرف اٹھتی ہے نہ کہ اس طرح جیسے کسی سی آئی ڈی کی نگاہ چور کی طرف اٹھتی ہے۔

آئیے اس سلسلہ میں اسوۂ رسولؐ کا مطالعہ کریں:

ایک قریشی نوجوان نے آنحضرتؐ کے پاس آ کر عرض کیا:

"اے اللہ کے رسولؐ! مجھے زنا کی اجازت دے دیجیے۔"

صحابۂ کرامؓ اس نوجوان کی جسارت پر بپھر گئے اور اس کو سخت سزا دینی چاہی، مگر نبی کریمؐ نے ایک دوسرا موقف اختیار کیا۔ آپؐ نے اسے قریب بلایا اور کہا۔ "کیا تم یہ بات اپنی ماں کے لیے پسند کرتے ہو؟"

نوجوان نے کہا: ۔ "میری جان آپؐ پر قربان ہو، خدا کی قسم، یہ بات میں اپنی ماں کے لیے کبھی پسند نہیں کر سکتا۔ پھر آپؐ نے اس کی بہن، پھوپھی اور خالہ کے بارے میں اسی

طرح سوالات کیے اور ہر سوال کے بعد اس سے پوچھتے: کیا تم اسے پسند کرتے ہو؟ اور وہ ہر بار یہی جواب دیتا: میری جان آپ پر قربان ہو، خدا کی قسم میں یہ پسند نہیں کر سکتا۔ آپ ہر جواب کے بعد فرماتے۔ "لوگ بھی اسے پسند نہیں کرتے۔ پھر آپ نے اپنا ہاتھ اس نوجوان کے سر پر رکھا اور دعا کی:

"اے اللہ! اس کے گناہوں کو معاف کر دے، اس کے دل کو پاک فرما دے، اس کی شرمگاہ کو برائیوں سے محفوظ کر دے۔"

اس کے بعد وہ نوجوان اس طرح کی کسی بُرائی کی طرف متوجہ نہیں ہوا۔

(طبرانی۔ مسند احمد)

غور کیجیے کتنا نازک موقع تھا مگر رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے کس حکمت اور نرمی کے ساتھ ایک نوجوان کے جذبات کو صحیح رخ دیا۔ وقتی طور پر یہ نوجوان جس جوش اور غلبۂ نفس کا شکار ہو گیا تھا آپ اس پر بھپرے نہیں بلکہ حسن ظن سے کام لیا کہ ایک عارضی اور وقتی نفسانی خواہش اس پر غالب آگئی ہے ورنہ اس کے باطن میں نیکی کا جذبہ پوشیدہ ہے۔ اگر وہ نوجوان طبیعت کا پاک نہ ہوتا تو اجازت ہی لینے کیوں آتا۔ چنانچہ آپ اس کی گستاخی سے چشم پوشی کرتے ہوئے اس کو مطمئن کرنے لگے۔ یہاں تک اس کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ زنا ایک نہایت ہی شنیع فعل ہے اور پھر وہ زندگی بھر اس طرح کے کسی گناہ کے قریب نہیں پھٹکا!

عام طور سے دیکھا گیا ہے کہ لوگ دوسروں کی خوبیوں کا کوئی تذکرہ نہیں کرتے لیکن اگر کسی سے کوئی چوک ہو جائے تو اس کا اس طرح سے چرچا کرتے ہیں کہ گویا اس شخص میں کوئی خوبی ہی نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقِ کار یہ تھا کہ وہ لوگوں کی اچھائیوں کا تذکرہ کرتے تھے۔ ان کی برائیوں پر پردہ ڈال دیا کرتے تھے۔ اگر آپ دیکھتے کہ کسی شخص میں بہت سی خوبیاں ہیں۔ دینِ اسلام کے فروغ کے سلسلہ میں اس کے بڑے کارنامے ہیں۔ اس نے دین کے لیے بڑی قربانیاں دی ہیں، اس کے باوجود اگر اس سے کوئی لغزش ہو جاتی تو آپ اس کے کارناموں کے مقابلہ میں اس کو

نظر انداز فرما دیتے۔

آنحضورؐ جب فتح مکہ کی تیاری کر رہے تھے تو آپؐ کی کوشش تھی کہ اس تیاری کی کوئی خبر باہر نہ جانے پائے۔ اس دوران حضرت حاطبؓ بن ابی بلتعہ سے ایک لغزش ہو گئی انھوں نے قریشِ مکہ کے نام ایک خط لکھ دیا جس میں فتح مکہ کی تیاری کی اطلاع دی گئی تھی۔ ظاہر ہے یہ لغزش خیانت کے مترادف تھی۔ اسی لیے جب یہ خط پکڑا گیا تو حضرت عمرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا:

"اے اللہ کے رسولؐ! مجھے اجازت دیجیے کہ میں اس کی گردن اڑا دوں۔ یہ منافق ہو گیا ہے۔"

لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ کریمی سے جو جواب ملا وہ یہ تھا: "عمرؓ تمھیں کیا معلوم؟ اللہ بدر والوں کے حالات سے آگاہ ہے۔ تبھی تو خدا نے کہا ہے:

"میں نے تم لوگوں کو معاف کر دیا۔" (بخاری، بحوالہ اسلامی بیداری ص۳۳)

دیکھیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حاطبؓ کی کتنی بڑی غلطی کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ اس لیے کہ آنحضورؐ کے سامنے حضرت حاطبؓ کے سابقہ کارنامے ہیں۔ انھیں بدر میں شرکت کی فضیلت حاصل ہے، ہجرت کرنے اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کا شرف حاصل ہے۔ ان تمام کارناموں کے مقابلہ میں جب حضرت حاطبؓ سخت قسم کی غلطی کر بیٹھتے ہیں تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اسے وقتی جذبات سے مغلوبیت سمجھ کر یا حضرت حاطبؓ کی اجتہادی غلطی سمجھ کر اور حسنِ ظن سے کام لے کر ان کو معاف کر دیتے ہیں۔ چنانچہ حضرت حاطبؓ نے اپنی صفائی میں یہی بات کہی کہ اے اللہ کے رسولؐ! فتح تو آپؐ کو ملنا ہی ہے خواہ قریشِ مکہ کو اطلاع ہو یا نہ ہو۔ میں نے یہ سوچا کہ مکہ میں میرے گھر والے گھرے ہوئے ہیں۔ اگر میں قریشِ مکہ کو اطلاع فراہم کر دوں گا تو ہو سکتا ہے وہ میرے احسان کے بدلے میں میرے گھر والوں کی حفاظت کریں۔

ایک اور مثال سنیے۔ ایک صحابی شراب پینے کے روگ میں مبتلا ہو گئے۔ ایک سے زائد بار شراب پینے کی حالت میں ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا گیا۔ ہر بار ان پر

مار پڑتی، سزا دی جاتی، لیکن ہر بار شیطان شراب کی لت بن کر ان پر غالب آجاتا اور وہ پھر شراب پی لیتے۔ پھر آنحضورؐ کے پاس ان کو لایا جاتا انھیں سزا دی جاتی مگر وہ پھر شراب پی لیتے۔ ایسا کئی بار ہوا۔ ایک بار جب انھیں شراب پینے کی حالت میں پکڑ کر لایا گیا تو کسی صحابیؓ نے کہا:

"کیا بات ہے۔ اللہ کی اس پر لعنت ہو! بار بار اسے لایا جاتا ہے۔"

جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت بھیجتے ہوئے سنا تو لعنت کرنے والے سے کہا: "اس پر لعنت نہ بھیجو، یہ اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبت رکھتا ہے۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ "اپنے دینی بھائی کے مقابلے میں شیطان کی مدد نہ کرو۔

(الصحوۃ الاسلامیہ)

رسولِ خدا کی وسیع القلبی کو دیکھیے کہ کس طرح آپؐ نے اس انسان کو اپنی شفقتوں کے سائے میں لے لیا۔ شراب نوشی کے گناہ میں لت پت ہونے کے باوجود اس کے بارے میں حسنِ ظن کا اظہار کیا۔ اس موقع پر بھی اس کے اچھے پہلو کا تذکرہ کیا اور یہ واضح کیا کہ اگر شراب نوشی بدترین قسم کا گناہ ہے مگر اسلامی اخوت کا رشتہ اب بھی باقی ہے اس لیے لعنت کرنے سے روکا کیونکہ اس سے ایمانی بھائیوں کے درمیان خلیج حائل ہو جاتی ہے۔ اہلِ ایمان اس سے دور ہو جاتے ہیں اور وہ اہلِ ایمان سے دور ہو جاتا ہے۔ نتیجتہً وہ شیطان سے قریب ہو جاتا ہے اس لیے آپؐ نے فرمایا کہ "اپنے بھائی کے مقابلے میں شیطان کے مددگار نہ بنو۔"

یہاں ٹھہر کر ان لوگوں کو غور کرنا چاہیئے جو خورد بین لیے دوسروں کے عیوب تلاش کرتے رہتے ہیں اور انھیں اپنے حساب سے ساقط کرتے رہتے ہیں۔ انھیں یہ واقعہ غور و فکر کی دعوت دیتا ہے کہ وہ رسولِ خدا کے بلند طریق تربیت اور دوررس نگاہ سے موعظت حاصل کریں۔

مقام وماحول کی سازگاری

انسان کی فکری وعملی تربیت میں اس کے ماحول کو بڑا دخل ہے خواہ وہ ماحول گھر کا ہو یا مدرسہ کا یا بستی کا۔ انسان جیسے ماحول میں رہتا ہے اس کے اثرات غیر شعوری طور پر وہ ضرور قبول کرتا ہے۔ ہم تو آئے دن دیکھتے ہیں کہ ایک شخص بہت صالح اور نیک ہے مگر اس کو کچھ ایام غلط قسم کے لوگوں کے درمیان گزارنے پڑے تو اس غلط صحبت نے اس کی بہت سی اچھائیوں کو ختم کر کے بہت سی برائیوں کو نشوونما دے دی۔ اسی طرح کوئی بہت خراب آدمی ہے مگر اسے اچھے لوگوں کی معیت نصیب ہو گئی تو وہ گناہوں سے توبہ کر کے نیک راستہ پر گامزن ہو جاتا ہے۔ اسی حقیقت کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

كُلُّ مَوْلُودٍ يُولَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ أَوْ يُنَصِّرَانِهِ أَوْ يُمَجِّسَانِهِ (بخاری)

ہر بچہ صحیح فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس کے والدین اس کو یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔

پاکیزہ معاشرہ اور اچھی صحبت انسان کو نیک بننے کا موقع فراہم کرتی ہے، نیک بننے پر آمادہ کرتی ہے اور معاون و مددگار ہوتی ہے جبکہ بگڑا ہوا معاشرہ اور بری صحبت انسان کو بگاڑ کی طرف لے جاتی ہے۔ اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الْمَرْءُ عَلَى دِينِ خَلِيلِهِ فَلْيَنْظُرْ أَحَدُكُمْ مَنْ يُخَالِلُ۔ (ترمذی)

انسان اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے اس لیے تم میں سے ہر ایک کو غور کرنا چاہیے کہ اس کی دوستی کس سے ہے۔

اگر کسی بیج کو اچھی زمین میں بویا جائے، مناسب آب وہوا پہنچائی جائے، وقت

پر کھاد دیا جائے، نرائی کی جائے تو یقیناً وہ بہترین پیداوار دے گا لیکن جب بیج کو اچھی زمین نہ ملے، نہ ہی مناسب ہوا کا انتظام ہو، کھاد اور نرائی سے بھی وہ محروم رہے تو ایسا بیج گل سڑ کر رہ جائے گا اور اس سے کوئی نفع ظاہر نہ ہو سکے گا۔ یہی حال انسانی فطرت کا بھی ہے۔

اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحابؓ کی تربیت کے سلسلہ میں اس بات کا بھرپور خیال رکھا کہ ان کے لیے ایک ایسا معاشرہ اور ماحول فراہم کیا جائے جہاں ان کی صلاحیتیں صحیح اور تعمیری رخ پر پروان چڑھ سکیں۔ پہلے پہل آپؐ نے کوشش کی کہ مکہ کی فضا کو اس کے لیے سازگار بنایا جائے مگر جب مکہ کی اجتماعی فضا نے یہ ثابت کر دیا کہ مکہ اس کے لیے تیار نہیں ہے، اس کے دامن میں جو موتی تھے انھیں وہ اسلام کے حوالہ کر چکا ہے۔ اب اس کے پاس خس وخاشاک کے سوا کچھ نہیں اور وہ اپنی گلیوں اور وادیوں کی فضا کو یہ اجازت دینے کے لیے تیار نہیں کہ وہ تعمیری و ایجابی پہلو سے دعوت و تربیت کے لیے مفید ہوں تو آپؐ کی نگاہ طائف کی طرف اٹھی مگر وہاں کی سنگدل قیادت نے پہلے ہی مرحلہ میں یہ ثابت کر دیا کہ طائف کی زمین ظاہری شادابی اور تروتازگی کے باوجود روحانی تربیت کے لیے سنگلاخ ہے۔ تو آپؐ کی نگاہیں حبش کی طرف گئیں اور آپؐ نے یہ سوچ کر اپنے اصحابؓ کو حبش کی جانب ہجرت کی اجازت دے دی کہ حبش کی سرزمین اصلاح و تربیت اور دعوت و تبلیغ کے نقطۂ نظر سے مکہ سے بہتر ہو گی اگرچہ حبش میں شاہ نجاشی کا بلند کردار سامنے آیا۔ مگر وہاں کی عیسائی قیادت نے یہ واضح کر دیا کہ حبش کی سرزمین بھی، رذالت و کمینگی اور مکر و سیہ کاری سے خالی نہیں ہے تب آپؐ کی نگاہ یثرب کی جانب اٹھی اور یثرب نے بادِ نسیم کے پہلے جھونکے کے آتے ہی یہ ثابت کر دیا کہ اسلام کو پروان چڑھنے اور ایک مستحکم ریاست کے وجود میں لانے کے لیے جو ماحول اور فضا درکار ہے وہ مدینہ میں بہم پہنچ سکتی ہے اگرچہ اس کے لیے قربانیوں کی ضرورت پڑے گی۔ چنانچہ اللہ کے رسولؐ نے اپنے اصحابؓ کو مدینہ کی جانب ہجرت کی اجازت دے دی۔ اور آخر میں خود بھی اپنے رفیق خاص حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ساتھ مدینہ تشریف

لے آئے :

ہجرت کا یہ مبارک سفر محض مجبوری و بے بسی کی وجہ سے نہیں کیا گیا تھا، محض مکہ والوں کے مظالم و مصائب سے تنگ آکر نہیں اختیار کیا گیا تھا بلکہ اس ہجرت کے پس منظر میں ایک عظیم مقصد پوشیدہ تھا اور وہ یہ تھا کہ تحریک اسلامی کامیابی کے آخری مرحلے تک پہنچانے اور اپنے اصحابؓ کو اقامتِ دین کے لیے مکمل طور پر تیار کرنے کے لیے ایسی جگہ کی ضرورت تھی جہاں کی اجتماعی فضا اس کے لیے سازگار ہو اور یہ سعادت یثرب کے حصے میں آئی جسے بعد میں مدینۂ رسولؐ کے نام سے پکارا جانے لگا۔

تاریخ اسلامی میں ہجرت کا یہ واقعہ تحریکِ اسلامی کے لیے ایک نیا رُخ اور ایک نیا موڑ تھا۔ آنحضورؐ اپنے اصحابؓ کے لیے ایک ایسا مقام چاہتے تھے جہاں آپؐ ان کے اندر کردار کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کر سکیں اور اسلامی حکومت سے متعلق تمام ذمہ داریوں کو ادا کرنے کی صلاحیتیں ان میں پیدا کر سکیں اور ان کو عملی تربیت دے سکیں۔

اپنے اصحابؓ کی تربیت کے سلسلہ میں آپ نے مقام و ماحول کی سازگاری کا کس قدر اہتمام کیا اس کا اندازہ کرنے کے لیے ہجرت کا واقعہ ہی کافی ہے۔

انسان کی اصلاح و تربیت میں مقام و ماحول کو کتنا دخل ہے اس کی وضاحت خود نبی کریمؐ نے ایک واقعہ سنا کر فرمائی۔

آپؐ نے فرمایا:

"تم سے پہلے لوگوں میں ایک شخص تھا اس نے ننانوے آدمیوں کو قتل کر ڈالا۔ پھر اس نے پوچھا کہ زمین پر سب سے زیادہ علم رکھنے والا شخص کون ہے؟ چنانچہ اسے ایک راہب کا پتہ بتا دیا گیا۔ وہ راہب کے پاس گیا اور کہا کہ "میں ننانوے آدمیوں کو قتل کر چکا ہوں، کیا میرے لیے توبہ کی کوئی صورت ہے؟" راہب نے کہا: "نہیں۔" یہ سن کر اس شخص نے راہب کو بھی قتل کر دیا اور اس طرح سو کا عدد پورا ہو گیا۔ اس نے پھر پوچھا کہ سب سے زیادہ علم رکھنے والا کون ہے؟ لوگوں نے اسے ایک عالم کا پتہ بتا دیا۔ وہ عالم کے پاس آیا اور بولا: "کہ میں سو آدمیوں کو قتل کر چکا

ہوں، تو کیا میرے لیے توبہ کی کوئی شکل ہے؟" عالم نے کہا " ہاں! توبہ اور تمہارے درمیان کون حائل ہو سکتا ہے؟ تم ایسا کرو کہ فلاں بستی کی طرف جاؤ، کیوں کہ وہاں کچھ لوگ اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ تم ان کے ساتھ اللہ کی عبادت کرو۔ اور اپنی قوم کی بستی کی طرف نہ آنا کیونکہ یہ بری بستی ہے۔ چنانچہ وہ وہاں سے چل دیا۔ ابھی آدھا راستہ ہی طے کیا تھا کہ اسے موت آگئی اس کی روح قبض کرنے کے سلسلہ میں رحمت اور عذاب کے فرشتوں کے درمیان اختلاف ہو گیا! رحمت کے فرشتوں نے کہا: "یہ شخص خلوصِ دل سے توبہ کرکے چلا ہے۔" عذاب کے فرشتوں نے کہا: "اس نے آج تک ایک بھی اچھا عمل نہیں کیا!" اتنے میں ایک فرشتہ آدمی کی صورت میں نمودار ہوا۔ فرشتوں نے اس کو اپنا ثالث بنا لیا۔ اس نے کہا: "دونوں بستیوں کے درمیان کی زمین ناپو، وہ جس بستی سے قریب ہو اس کو اسی میں شمار کر لو۔" چنانچہ انھوں نے زمین کو ناپا اور اس کو اس (نیک) بستی سے قریب پایا جس کا اس نے قصد کیا تھا۔ چنانچہ رحمت کے فرشتوں نے اس کی روح قبض کر لی۔" (مسلم)

اس حدیث سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ صالح معاشرہ اور اچھے ساتھی سیرت و کردار کی تعمیر میں بہت ہی اہم رول ادا کرتے ہیں اور بری بستی بگڑا ہوا ماحول، بُرے دوست انسانوں کو بگاڑنے میں ممد و معاون ہوتے ہیں۔

خدا سے دعا ہے کہ وہ ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ ہم اپنے لیے بھی اور اپنے متعلقین کے لیے صالح لوگوں، نیک دوستوں اور پاکیزہ معاشرت کا انتخاب کر سکیں۔

عوامی ربط و ضبط

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کی اصلاح و تربیت کے سلسلہ میں عام سماجی رابطہ سے بڑا کام لیا۔ آپؐ نے اپنے تعلقات کو صرف ضابطہ کی حد تک محدود نہ رکھا بلکہ تمام انسانوں سے عموماً اور اپنے اصحاب سے خصوصاً بہت قریبی ربط و ضبط رکھا۔ دیکھا گیا ہے کہ اصلاح و تربیت کا کام کرنے والے اپنے کو سنبھال کر اور عوام سے کاٹ کر رکھتے ہیں لیکن رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم مقامِ نبوت پر فائز ہونے کے باوجود عوامی حلقوں سے گہرا ربط رکھتے تھے معاشرہ کے افراد سے ذاتی اور نجی تعلقات رکھتے تھے۔ لوگوں کے کام آتے ان کی مدد کرتے ان کو اچھے مشوروں سے نوازتے اور اس طرح پورے معاشرہ میں باہمی محبت اور ربط و ضبط کی فضا بنائے رکھتے جو کسی بھی معاشرہ کے ارتقاء کے لیے ضروری ہے۔

آپ لوگوں سے کٹ کر نہ رہتے بلکہ ان میں گھل مل کر رہتے، ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانے، سفر میں ان کے ساتھ کھانا پکانے کے لیے لکڑیاں چنتے، مسجد کی تعمیر ہوتی تو آپؐ خود بھی پتھر چُن چُن کر لاتے۔ خندق کی کھدائی کا موقع آیا تو آپؐ نے بھی کدال سنبھالی اور صحابہؓ کے ساتھ خندق کھودی۔ جنگ کا موقع ہوتا تو صحابہؓ کے ساتھ آخر وقت تک شریک رہتے۔ اپنے رفقاء کے غم اور خوشی کو اپنا غم اور خوشی سمجھتے ان کے غم اور خوشی میں شریک ہوتے، ان کے دکھ درد کو بانٹ لیتے، مصیبت زدوں کا سہارا بنتے، پریشان حال لوگوں کی مدد کرتے، ٹوٹے دلوں کو جوڑتے، غم زدوں کے زخموں پر مرہم رکھتے، اپنے حسنِ سلوک اور سچی مسکراہٹوں سے لوگوں کے دکھوں کا مداوا کرتے۔

سیرت و احادیث کا مطالعہ کرنے سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ آپ ایک عام

انسان کی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ اپنے کسی عمل یا روش سے یہ ظاہر کبھی نہ ہونے دیتے کہ آپؐ اپنے کو کسی سے بالاتر سمجھتے ہیں۔

آپؐ کا معمول تھا کہ راستے میں ملنے والوں کو سلام کرتے، سلام کرنے میں پہل کرتے۔ ایک بار بچوں کے پاس سے گزر ہوا تو ان کو سلام کیا۔ ایک مرتبہ عورتوں کے پاس سے گزرے تو انھیں بھی سلام کیا۔ گھر میں داخل ہوتے ہوئے اور گھر سے نکلتے ہوئے گھر کے افراد کو سلام کرتے۔ کوئی ساتھی کئی دن کے بعد ملتا تو اس سے معانقہ بھی کرتے۔ کبھی کبھی پیشانی چوم لیتے۔ رخصت کرتے ہوئے دعا میں یاد رکھنے کی درخواست کرتے۔ احباب سے مصافحہ بھی کرتے اور اس وقت تک اپنا ہاتھ نہ کھینچتے جب تک دوسرا اپنا ہاتھ نہ کھینچ لیتا۔

کسی کو کوئی پیغام پہنچانا ہوتا تو سلام ضرور کہلاتے۔ احباب اور رشتہ داروں کو ہدیے دیتے ان کے ہدیے بھی شکریہ کے ساتھ قبول کرتے اور فرماتے "ہدیہ دینے اور لینے سے محبت بڑھتی ہے۔"

مجلس میں جاتے تو کنارے ہی بیٹھ جاتے، کندھوں کو پھاند کر آگے نہ بڑھتے، اپنے لیے کسی خاص مقام کا انتخاب نہ کرتے اور نہ ہی صحابہؓ کو اجازت دیتے کہ وہ آپؐ کی تعظیم کے لیے کھڑے ہوں! مجلس میں جو موضوع چل رہا ہوتا اسی میں شریک ہو جاتے، الگ سے کوئی موضوع نہ چھیڑتے۔ کسی کی بات کو کبھی نہ کاٹتے۔ کہنے والے کی پوری بات سنتے، اور اسے اطمینان بخش جواب دیتے۔ کوئی پکارتا تو ہمیشہ لبّیک (حاضر ہوں) کہتے۔ ایک بار مدینہ کی ایک نیم پاگل عورت نے آپؐ سے گفتگو کرنا چاہی، آپ نے اس کی پوری بات سنی اور اس کا کام کر کے دیا۔

بیماروں کی عیادت کرتے۔ یہاں تک کہ منافقوں کے سردار عبداللہ بن اُبی تک کی عیادت فرمائی۔ عام طور سے بیمار کے سرہانے بیٹھ کر پوچھتے، تمھاری طبیعت کیسی ہے؟ بیمار کی پیشانی اور نبض پہ ہاتھ رکھتے، کبھی چہرے، سینہ اور پیٹ پر دستِ شفقت پھیرتے۔ بیمار کو تسلی دیتے۔ اور فرماتے لَا بَأْسَ اِنْشَاءَ اللّٰہُ طَھُوْرٌ (پریشانی کی کوئی بات نہیں خدا نے چاہا تو بہت جلد صحت حاصل ہوگی) کھانے کے لیے پوچھتے اور پرہیزی کھانے کا اہتمام فرماتے۔ ایک بار حضرت جابرؓ

بیمار پڑے تو حضرت ابو بکرؓ کے ساتھ ان کی عیادت کے لیے بہت دور تک پیدل چل کر گئے پہنچے تو حضرت جابرؓ بے ہوش پڑے تھے۔ آپ نے وضو کیا، پانی کے چھینٹے دیئے اور مریض کے لیے دعا کی!

اگر کسی کے عالم نزع کے بارے میں معلوم ہو جاتا یا آپ کو اطلاع دی جاتی تو فوراً پہنچتے. توبہ الی اللہ کی ہدایت کرتے۔ کسی کی وفات کی اطلاع ملتی تو فوراً اس کے گھر پہنچتے۔ پس ماندگان کو صبر کی تلقین کرتے اور ان کے ساتھ ہمدردی کا اظہار فرماتے۔ تجہیز و تکفین میں جلدی کراتے. جنازہ اٹھتا تو خود بھی جنازہ کے ساتھ ساتھ جاتے۔ مسلمان کا جنازہ خود پڑھاتے اور اس کے لیے دعائے مغفرت کرتے!

ضرورت پڑتی تو لوگوں کے بہت سے کام کر دیتے۔ عورتوں کا سودا سلف بازار سے لا دیتے۔ غریبوں کی مدد کرتے، گنجائش ہوتی تو لوگوں کو قرض دے دیتے یا قرض دلا دیتے۔ بھوکوں کو کھانا کھلاتے، غلاموں کی آزادی کا بندوبست فرماتے۔ یتیموں، بیواؤں، مسکینوں کی امداد فرماتے اور ان کی امداد پر ابھارتے۔ سماج کے کمزور طبقات کو اونچا اٹھانے کی کوشش کرتے۔

ہمیشہ خندہ پیشانی سے پیش آتے۔ اپنے اصحاب کے ساتھ مزاح و مذاق بھی کرتے ان کے ساتھ تیراکی اور تیر اندازی کے مقابلے میں بھی شریک ہوتے۔

مختصر یہ کہ نبی کریمؐ نے اپنے کو سماج سے اس قدر قریب کر رکھا تھا کہ سماج کا ہر فرد یہ سمجھتا تھا کہ اللہ کے رسولؐ سب سے زیادہ اسی سے قربت و محبت رکھتے ہیں۔ یہ برتاؤ اور سلوک صحابہ کرامؓ کے دلوں میں اپنا گھر بنا لیتا تھا۔ اور صحابہ کرامؓ آپؐ کے اس برتاؤ سے اپنے لیے غذا حاصل کرتے تھے۔

تربیت کے سلسلہ میں انسان کے ذاتی تعلقات اور سماجی روابط کا بڑا اثر پڑتا ہے۔ اصلاح و تربیت کا فریضہ انجام دینے والوں کی ذمہ داری قرار پاتی ہے کہ اپنے زیر تربیت افراد اور سماج کی اکائیوں سے زیادہ سے زیادہ گہرا تعلق پیدا کریں۔ غمزدوں کے زخموں پر پھاہا رکھیں۔ گرتے ہوؤں کو سہارا دیں۔ قرض کے بوجھ کے نیچے دبنے والے

کو اس بوجھ سے نجات دلائیں غریب الدیار اور پردیسی کے لیے ٹھکانہ فراہم کریں۔ ناخواندہ کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کریں۔ کمزوروں اور زیردستوں کو اوپر اٹھانے کی کوشش کریں۔ پھر دیکھیے یہ کردار کس طرح تربیت میں اہم رول ادا کرتا ہے۔ نبی کریم ؐ نے ایسی ہی فضا قائم کرنے کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا:۔

"ہر روز جب سورج طلوع ہوتا ہے تو انسان کی انگلیوں کے ہر پورے پر صدقہ واجب ہوتا ہے۔ دو انسانوں کے درمیان انصاف کرنا صدقہ ہے۔ جب کوئی انسان کسی انسان کے سوار ہونے میں مدد دیتا ہے، اس کے سامان کو لاد دیتا ہے یا اتار دیتا ہے تو یہ بھی صدقہ ہے۔ کسی سے اچھی بات کہنا بھی صدقہ ہے۔ ہر قدم جو نماز کے لیے اٹھتا ہے وہ بھی صدقہ ہے۔ تکلیف دہ چیز کا راستہ سے ہٹا دینا بھی صدقہ ہے۔"

(متفق علیہ)

عملی نمونہ پیش کرنا

آپؐ نے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے سینوں میں خدا اور رسولؐ سے عشق و محبت کی ایسی بھٹی شعلہ زن کی تھی جس میں وقتی مصلحت و خود غرضی کا ہر شائبہ جل کر خاکستر ہو گیا تھا۔ آپؐ نے اسلامی افکار و عقائد کو دلوں میں اس طرح راسخ کیا تھا کہ کسی بھی غیر اسلامی تصور کے ابھرنے یا پنپنے کی کوئی گنجائش باقی نہ رہ گئی تھی۔ آپؐ نے ان کی زندگیوں کو وہ قوتِ عمل اور کردار کی پختگی عطا کی تھی کہ بے عملی و بے کرداری بے معنی ہو کر رہ گئی تھی۔ یہ افکار و اوصاف پروان چڑھانے کے لیے اگر ایک طرف قرآن اور آنحضورؐ کا وہ طریقۂ تربیت جس کا ہم اوپر تذکرہ کر آئے ہیں۔ صحابۂ کرامؓ کے فکر و عمل کو سب سے زیادہ نمو اور جلا بخش رہا تھا تو دوسری طرف آپؐ کی عملی زندگی نے صحابۂ کرامؓ کو وہ قوتِ عمل عطا کی جس پر ہر مؤرخ انگشت بدنداں ہے۔

اگر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت، آپؐ کا پیغام، صرف آپؐ کی زبان کی حد تک رہتا تو یہ دعوت تمام تر خوبیوں کے باوجود دھوئیں کے مرغولوں کی طرح ہوا میں تحلیل ہو گئی ہوتی۔ اسے پانی کے رنگین بلبلوں اور سمندر کے جھاگوں سے زیادہ ثبات و دوام حاصل نہ ہوتا۔ اگر لوگ آنحضورؐ کے قول و عمل میں ذرا سا بھی تضاد دیکھتے تو وہ پروانہ وار آپؐ پر نچھاور نہ ہوتے، آپؐ کے حکم پر اپنی دنیا کو برباد نہ کرتے۔ مگر انھوں نے دیکھا کہ اللہ کا یہ رسولؐ جو بھی لفظ زبان سے نکالتا ہے اس کی زندگی خود اُس کی آئینہ دار ہے، یہ جو بھی حکم دیتا ہے اس کی خود پابندی کرتا ہے اور یہ خود اپنے ارشادات کی جیتی جاگتی عملی تصویر ہے۔ آپؐ کے قول و عمل کی یکسانیت وہ قوتِ محرکہ تھی جس نے صحابۂ کرامؓ

کی زندگیوں میں عظیم انقلاب بپا کر دیا۔ آپؐ کے ساتھ رہنے والا ہر شخص بلکہ آپؐ کی زندگی کی ایک جھلک دیکھنے والا بھی بے ساختہ پکار اُٹھتا تھا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپؐ اللہ کے رسولؐ ہیں۔ آپؐ کی زندگی نہ دنیا کے حکمرانوں کی طرح ہے جو رعایا کے سامنے کچھ ہوتے ہیں، پیچھے کچھ، نہ آپؐ کی روش صاحبانِ ثروت سے میل کھاتی ہے، جن کا سلوک اپنے ماتحتوں کے ساتھ دوُرخا ہوتا ہے۔ نہ ہی آپؐ شاعروں سے مشابہت رکھتے تھے، جن کے اشعار دل کی گہرائیوں میں تو اُترتے ہیں مگر اُن کا عمل ان کے اشعار کا ساتھ نہیں دے پاتا۔ نہ آپؐ جادوگر ہیں کہ جن کے الفاظ میں سحر ہوتا ہے مگر عمل سے وہ بالکل کورے ہوتے ہیں۔ بلکہ زندگی کے ہر مرحلہ پر قول وعمل میں یکسانیت ہے۔ آپ ایسا نمونہ تھے کہ صحابۂ کرامؓ آپؐ کے عمل سے رشد وہدایت حاصل کرتے تھے۔ نازک ترین مرحلوں پر نبی کریمؐ کے اسوۂ مبارک نے صحابہ کرامؓ کو حوصلہ بخشا ہے۔ حضرت عائشہؓ نے آپؐ کو سب سے زیادہ قریب سے دیکھا۔ وہ آپؐ کے اُسوہ کی گواہی ان الفاظ میں دیتی ہیں "کان خُلُقُہُ القرآن"۔ یعنی آپؐ کی سیرت قرآن کی جیتی جاگتی تصویر تھی۔

اگر آنحضورؐ نے عقائد کی پختگی اور خدا سے اپنے تعلق کو مضبوط کرنے پر سب سے زیادہ زور دیا تو عمل سے بھی خدا کی کارسازی پر یقین کا اظہار اور خدا سے گہرے تعلق کی گواہی پیش کرتے رہے۔ ایک بار ایک غزوہ سے واپس آرہے تھے۔ ایک منزل پر پہنچ کر آپؐ نے صحابۂ کرام کو آرام کرنے کا حکم دیا۔ آپؐ نے خود بھی اپنی تلوار ببول کے ایک پیڑ پر لٹکائی اور استراحت فرمانے لگے۔ تھوڑی دیر بعد ایک دشمنِ خدا ادھر آنکلا۔ اس نے موقع کو غنیمت سمجھا۔ پیارے نبیؐ کا تلوار لی اور اُسے ناپاک ارادے سے سونتا۔ تلوار سونتنے کی آواز سے نبی کریمؐ نیند سے بیدار ہوگئے دیکھا کہ دشمن ننگی تلوار لیے آپؐ پر حملہ کے لیے تیار ہے۔ آپؐ فوراً کھڑے ہوگئے۔ دشمنِ خدا نے تلوار دکھاتے ہوئے کہا:

"من یمنعک منی؟" تمھیں مجھ سے کون بچائے گا؟

آپؐ کی زبان سے بیساختہ نکلتا ہے:

"اللہ" ــــ مجھے اللہ بچائے گا!"

یہ لفظ یقین و اعتماد کی اتنی گرمی اور طاقت لیے ہوئے تھا کہ سنتے ہی دشمنِ خدا کے ہاتھ پیر کپکپانے لگتے ہیں، اور اُس کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ کر گر جاتی ہے۔ آنحضورؐ تلوار اُٹھا لیتے ہیں اور دشمنِ خدا کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں۔ بتاؤ اب تمھیں مجھ سے کون بچائے گا۔ دشمن معافی کی درخواست کرتا ہے اور آپ اس شرط پر معاف کر دیتے ہیں کہ وہ اب آئندہ نہ کبھی آپؐ سے لڑے گا نہ آپؐ کے اصحاب سے، اور آپؐ کے دشمنوں کا کبھی ساتھ نہ دے گا۔

اس واقعہ کے اس پہلو پر غور کیجیے کہ آپؐ تلوار سونتنے کی آواز سے بیدار ہوتے ہیں اور یکایک یہ دیکھتے ہیں کہ ننگی تلوار دشمنِ خدا کے ہاتھ میں ہے اور وہ فاتحانہ انداز میں پوچھتا ہے کہ آپؐ کو کون مجھ سے بچائے گا۔ آپؐ کے پاس سوچنے سمجھنے اور فیصلہ کرنے کے لیے وقت بھی نہیں ہے۔ آپ جس خدا کی ذات پر یقین کی تعلیم دیتے رہے ہیں، جسے تمام وسائل و اختیارات کا مرجع قرار دیتے ہیں، بلا تامل اس ذاتِ واحد کا نام آپؐ کی زبان پر جاری ہو جاتا ہے۔ نہ کسی طرح کی گھبراہٹ ہے نہ مایوسی بلکہ مومنانہ عزیمت کے ساتھ خدا کی ذات پر یقین و ایمان کی گواہی اپنے عمل سے پیش فرماتے ہیں۔

خدا سے اپنا تعلق مستحکم کرنے کے لیے اتنی عبادت کرتے اور راتوں کو اس قدر نماز پڑھتے کہ پائے مبارک پر ورم آجاتا۔ اور جب آپؐ سے پوچھا جاتا ہے کہ اے اللہ کے رسولؐ آپ کے تمام اگلے اور پچھلے گناہ تو معاف کر دیئے گئے ہیں۔ پھر آپؐ اس قدر عبادت کیوں کرتے ہیں، تو آپؐ فرماتے:

"اَفَلَا اَکُوْنُ عَبْدًا شَکُوْرًا" کیا میں خدا کا شکر گذار بندہ نہ بنوں؟"

(بخاری و مسلم)

آپؐ نفلی عبادت میں ناغہ فرما دیتے کہ آپؐ کا یہ عمل تواتر کی وجہ سے کہیں اُمت پر فرض نہ کر دیا جائے۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ "آپؐ کوئی عمل کرنا چاہتے تھے مگر اُس کو اس لیے چھوڑ دیتے تھے کہ کہیں امت پر فرض نہ ہو جائے۔"

غزوۂ خندق کے موقع پر ایک صحابی رسولِ اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے فقر و فاقہ کی شکایت کرتے ہیں اور دامن اٹھا کر پیٹ پر بندھا ہوا پتھر دکھاتے ہیں اور غرض

کرتے ہیں" اے اللہ کے رسولؐ ہم نے شدت بھوک سے پیٹ پر پتھر باندھ رکھا ہے" اللہ کے رسولؐ کوئی وعظ و نصیحت نہیں فرماتے۔ حالات کی سنگینی اور صحابہؓ کی ابتلا و آزمائش کا نقشہ نہیں کھینچتے ہیں، خشک لب و لہجہ میں صبر کی تلقین نہیں فرماتے ہیں بلکہ آپؐ جواب میں اپنے بطنِ مبارک سے چادر ہٹاتے ہیں تو شکایت کرنے والا یہ دیکھ کر کہ اللہ کے رسولؐ نے اپنے پیٹ پر ایک کے بجائے دو پتھر باندھ رکھے ہیں، اپنی شکایت پر پشیمان ہو جاتا ہے اور صبر و رضا کا پیکر بن جاتا ہے۔ پھر تمام حاضرین ابتلا و آزمائش کی تلخیوں میں لذت و حلاوت محسوس کرنے لگتے ہیں۔

جود و سخا کی تعلیم دینے والا یہ نبیؐ بھوکوں کو اپنا کھانا کھلا کر کئی کئی دن تک بھوکا رہتا ہے۔ حضرت انسؓ اس بات کی گواہی پیش کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ سے جب بھی کوئی چیز طلب کی گئی آپؐ کی زبان سے کسی نے لفظ "نا" نہیں سنا۔ ایک بار ایک شخص نے خدمتِ رسالت مآب میں حاضر ہو کر دستِ سوال دراز کیا۔ آپؐ نے اس کو بے شمار بکریاں عطا کیں اس نے اپنی قوم میں واپس جا کر کہا کہ تم سب لوگ اسلام قبول کر لو کیوں کہ محمدؐ اتنا عطا کرتے ہیں کہ پھر فقر و فاقہ کا کوئی ڈر نہیں رہتا۔ (تربیۃ الاولاد بحوالہ حافظ ابو الشیخ)

زہد و قناعت کی تلقین کرنے والے نبیؐ کا خود یہ حال کہ چٹائی پر سوتے ہیں تو پہلو پر اس کے نشانات نمایاں ہو جاتے ہیں۔ صحابۂ کرامؓ عرض کرتے ہیں کہ اے اللہ کے رسولؐ! کیوں نہ ہم ایک بچھونا تیار کر دیں تاکہ اسے آپؐ چٹائی پر بچھا لیا کریں۔ آپ ارشاد فرماتے ہیں: " مجھے دنیا سے کیا لینا ہے، میرا تو بس اس سے اتنا ہی تعلق ہے جیسے کوئی سوار کسی پیڑ کے نیچے سستانے کے لیے بیٹھے۔ پھر وہاں سے چل دے۔" حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہؐ جب مدینہ تشریف لائے تو اس وقت سے وفات پانے تک کبھی بھی آپؐ نے تین دن تک مسلسل گیہوں کی روٹی نہیں کھائی۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسولِ خدا کو ایک بار حضرت فاطمہؓ نے جو کی روٹی کا ایک ٹکڑا پیش کیا۔ آنحضورؐ نے اس کو تناول کر کے ارشاد فرمایا: "تین دن کے دوران یہ پہلی چیز ہے جو میں نے کھائی ہے۔" (مسند احمد)

یہ بات بھی ذہن میں رہنا چاہیے کہ آنحضورؐ کا یہ زہد و قناعت، تنگ دستی یا عدمِ وسائل

کی بنیاد پہ نہیں تھا۔ آپ اگر چاہتے تو احد کا پہاڑ آپ کے لیے سونا بنا دیا جاتا، دنیا کی تمام نعمتیں آپ کے لیے سراپا انتظار تھیں مگر آپ انسانوں کو زہد و قناعت کی جو تعلیم دیتے تھے اس کا عملی نمونہ خود پیش فرمانا چاہتے تھے۔

صبر و عزیمت کا درس دینے والا یہ نبیؐ ابتلاء و آزمائش کے ہر محاذ پر سراپا صبر و عزیمت نظر آتا ہے۔ مکہ کا طوفانی دورِ آزمائش ہو یا مدینہ کا پیچیدہ و پُرفتن دور، ہر جگہ نبی کریمؐ صبر و استقامت کے پیکر نظر آتے ہیں۔ جب مکہ کی گلیوں میں آپؐ کا مذاق اڑایا جاتا ہے، نماز پڑھتے ہوئے رسی کے پھندے سے آپؐ کا گلا گھونٹا جاتا ہے، راہ چلتے ہوئے اوجھ اور غلاظت کے ڈھیر آپؐ پر پھینکے جاتے ہیں۔ راہوں میں کانٹے بچھا دئے جاتے ہیں، شعب ابی طالب میں قید کر دیا جاتا ہے، طائف میں اوباش لڑکے اور غنڈے آپؐ کے پیچھے لگا دیئے جاتے ہیں، وہ آپؐ پر پتھر پھینکتے ہیں، آپ لہولہان ہو جاتے ہیں۔ اس کے باوجود پائے ثبات میں کوئی لغزش نہیں آتی بلکہ پورے اطمینان کے ساتھ آپؐ فرماتے ہیں کہ سب سے سخت آزمائش انبیاء کی ہوتی ہے۔ کفارِ قریش سے تنگ آ کر جب آپؐ کے چچا محبت و پیار کے جذبہ سے سرشار آپؐ کو سمجھاتے ہیں اور اس مشن سے باز رہنے کی تلقین کرتے ہیں تو صبر و عزیمت کا پیکر بن کر آپ فرماتے ہیں۔ "اے میرے چچا! اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے ہاتھ پر چاند رکھ دیں تب بھی میں اپنے مشن سے باز نہیں آؤں گا۔ آپؐ کا یہ عمل صحابہؓ کے لیے نشانِ راہ بنتا ہے، آزمائش کی دھوپ کی تمازت ان کے لیے شجرِ سایہ دار کا مزہ دیتی ہے اور صحابہ ابتلاء و آزمائش کے تمام مرحلوں سے مسکراتے ہوئے گزر جاتے ہیں اور جب دار و رسن سے واسطہ پڑتا ہے تو ان کی روح جسم سے پرواز کرتے ہوئے پکار اٹھتی ہے۔ فُزْتُ بِرَبِّ الْكَعْبَةِ ۔ رب کعبہ کی قسم آج مجھے کامیابی نصیب ہو گئی۔"

جرأت و شجاعت کا سبق دینے والا نبیؐ جب سنگین حالات میں گھرتا ہے تو اس کی جرأت و شجاعت دوسروں کو حوصلہ دیتی ہے۔ یہ وہ خوفناک رات ہے جب قریش کے جیالوں نے خون آشام تلواروں کے ساتھ کاشانۂ نبوت کو اس ناپاک ارادہ

سے گھیر رکھا ہے کہ آپؐ کے باہر نکلتے ہی ان کی تلواریں یکبارگی آپؐ کے جسم مبارک پر گر پڑیں گی اور آپؐ کے وجود کو زمین سے نیست و نابود کر دیں گی۔ اللہ کے رسولؐ بیدار ہوتے ہیں، رات کے سناٹے میں اس منظر کو دیکھتے ہیں مگر کفار کے ناپاک عزائم، بے نیام تلواروں کی چھپاہٹ آپؐ کی جرأت و بیباکی کے سامنے ماند پڑ جاتی ہے۔ آپؐ نہایت سکون اور اطمینان سے رخت سفر باندھتے ہوئے گھر سے باہر تشریف لے آتے ہیں۔ اللہ کی حفاظت و نصرت ساتھ ساتھ ہے۔ کفار پر اونگھ طاری ہو جاتی ہے اور قافلۂ رسالت اطمینان کے ساتھ گزرتا ہوا غارِ ثور میں پناہ گزیں ہو جاتا ہے پھر تعاقب کرنے والوں کو غار کی جانب آتا دیکھ کر حضرت ابوبکرؓ تشویش میں پڑ جاتے ہیں مگر آنحضورؐ کی زبانِ مبارک سے "لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا" کے الفاظ سن کر ان کا خوف بھی کافور ہو جاتا ہے اور ان میں اعتماد و حوصلہ کی ایک نئی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

غزوۂ حنین کے موقع پر جب خطرہ کی نزاکت کا مرحلہ آتا ہے تو لوگ گھبرا کر میدانِ جنگ سے فرار ہونا شروع ہو جاتے ہیں مگر اللہ کے رسولؐ اپنے خچر پر سوار میدانِ جنگ میں ڈٹے نہایت جرأت و استقامت کا ثبوت دے دیتے ہیں۔ آپ کی زبانِ مبارک پر نہایت حوصلہ و اعتماد سے یہ الفاظ جاری ہیں: أَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِبْ - أَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبْ۔ (بطل الابطال)

ایک بار رات کو مدینہ میں شور بپا ہوا، تمام لوگ خوفزدہ ہو گئے۔ گھبرا کر اپنے گھروں سے نکلے اور بلند ہونے والی آواز کی طرف دوڑنے لگے۔ لوگ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اس خوفناک صورتِ حال میں آواز تک پہنچنے والا پہلا شخص اللہ کا رسولؐ ہے جو بغیر زین کے گھوڑے پر سوار ہے، تلوار گردن میں لٹکی ہے اور بآوازِ بلند پکار رہا ہے کہ "اے لوگو، تم بالکل نہ گھبراؤ کوئی بات نہیں ہے۔" (بطل الابطال)

دیکھا آپ نے کہ جب جب خطرناک حالات درپیش ہوتے ہیں تو آپ سب سے زیادہ ثابت قدم نظر آتے ہیں اور جب خطرہ کا اندیشہ ہوتا ہے تو آپؐ وہاں سب سے پہلے پہنچتے ہیں۔

حلم وبردباری کا نمونہ دیکھنا ہو تو یاد کرو وہ واقعہ جب آنحضورؐ حضرت انسؓ کے ساتھ کہیں تشریف لے جا رہے تھے۔ آپؐ کے شانوں پر ایک کھردرے چھور والی نجرانی چادر پڑی ہوئی تھی۔ ایک بدو پیچھے سے آیا اور اس نے اس زور سے آپؐ کی چادر کھینچی کہ آپؐ کے شانے چھل گئے اور کہا کہ اے محمدؐ! مجھے اس مال میں سے دینے کا حکم دیجئے جو اللہ نے آپؐ کو دیا ہے۔ آنحضورؐ نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ آپؐ کے لبوں پر تبسم آگیا اور آپؐ نے اسے عطیہ دینے کا حکم فرمایا۔ (بخاری ومسلم)

آپؐ نے عفو ودرگزر اختیار کرنے کی نصیحت کی تو خود عفو ودرگزر کی ایک ایسی مثال پیش کی جس کی نظیر پوری تاریخ انسانی میں کبھی نہیں ملتی۔

یاد کیجئے فتح مکہ کا واقعہ جب آپؐ مکہ میں فاتحانہ داخل ہوئے۔ آپؐ کے سامنے آپؐ کے وہ دشمن جو مسلسل بیس سال تک آپؐ سے جنگ کرتے رہے تھے، بے بس کھڑے تھے۔ یہ لوگ قانونی لحاظ سے، سماجی اعتبار سے اور اخلاقی نقطۂ نظر سے گویا کہ ہر طرح مجرم اور قابل گردن زدنی تھے۔ اگر آپؐ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو جی بھر کر انتقام لیتا مگر آپؐ کی صفتِ عفو ان کے تمام مظالم پر غالب آجاتی ہے اور آپؐ اعلان فرماتے ہیں:

لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ، اِذْهَبُوا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ "آج تم پر کوئی گرفت نہیں۔ جاؤ تم سب آزاد ہو۔" یہی نہیں بلکہ ان کو مال ودولت عطا کرتے ہیں۔ انھیں مناصب سونپتے ہیں۔

آپؐ نے ضیافت ومہمان نوازی کی تعلیم دی تو خود اس کا بہترین نمونہ پیش کیا۔ ایک بار ایک کافر آپؐ کے یہاں مہمان ہوا۔ آپؐ نے اس کے لیے بکری کا دودھ منگایا وہ سب دودھ پی گیا۔ آپؐ نے دوسری بکری کا دودھ منگوایا۔ وہ، یہ بھی پی گیا۔ جب تک اس کا پیٹ نہ بھر گیا آپؐ اس کو دودھ پلاتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ سات بکریوں کا دودھ پی گیا۔ ایک بار آپؐ کے ایک مہمان نے رات کو بستر خراب کر دیا اور صبح ہونے سے پہلے فرار ہو گیا۔ آپؐ نے بستر کو دیکھا تو غلاظت سے بھرا تھا آپؐ نے اپنے دستِ مبارک سے اسے دھونا شروع کیا۔ صحابۂ کرامؓ نے عرض کیا کہ اللہ کے رسولؐ! اس خدمت کے لیے ہم حاضر ہیں۔

آپؐ نے فرمایا "وہ میرا مہمان تھا۔"

آپؐ نے اپنے ہاتھ سے کام کرنے کی ترغیب دوسروں ہی کو نہیں دی بلکہ اپنے تمام کام خود اپنے ہاتھ سے کر کے دکھائے۔ گھر میں رہتے تو گھر کے کام کاج اپنے ہاتھوں سے کر لیتے۔ پھٹے پرانے کپڑے خود رفو کر لیتے۔ اپنے جوتے خود گانٹھ لیتے۔ بکریوں کا دودھ خود دوہتے۔ مجمع میں بیٹھتے تو کسی نمایاں جگہ نہ بیٹھتے۔ سب کے برابر ہو کر بیٹھتے۔ صحابہؓ کے ساتھ باہر ہوتے تو تمام کاموں میں خود کو شریک رکھتے۔ مسجدِ نبوی کی تعمیر ہوئی تو خود بھی سب کے ساتھ مل کر کام کیا۔ خندق کی کھدائی میں آپؐ نے خود بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

آپؐ نے غریبوں اور مسکینوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تلقین فرمائی تو خود بھی اُن کے ساتھ حسنِ سلوک کیا۔ آپ کی پیاری بیٹی حضرت فاطمہؓ کے ہاتھ چکی پیستے پیستے گھس گئے تھے۔ مشک میں پانی بھر بھر کے لانے سے سینہ پر نیل کے داغ پڑ گئے تھے۔ اس دوران اللہ کے رسولؐ کے پاس کچھ غلام اور باندیاں لائی گئیں۔ حضرت فاطمہؓ اپنی خدمت کے لیے ایک باندی چاہتی تھیں۔ آپؐ نے فرمایا "بیٹی! ابھی صفہ کے غریبوں اور مسکینوں کا انتظام کرنا باقی ہے۔" اور اپنی بیٹی کو کچھ تسبیحات بتا کر رخصت کر دیا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عملی کردار تھا جو اپنے اصحابؓ کی ہمہ جہت تربیت کر رہا تھا۔ آپؐ کا کردار سب سے بڑا داعی اور مربی تھا۔ آپؐ کی ذات حسنِ عمل اور حسنِ اخلاق کا سرچشمہ تھی۔ آپؐ جو زبان سے کہتے، جو دلائل دیتے، جو اپیل کرتے، جو تنقید کرتے، اس میں کردار و عمل کی جاذبیت اور تاثیر کارفرما ہوتی۔ اسی لیے صحابہ کرامؓ اپنی اپنی سیرتوں کے لیے آپؐ کے چشمہ کردار سے فیض یاب ہو رہے تھے، آپؐ کی بلند کرداری نے صحابہ کرامؓ کو آپؐ کا شیفتہ و فریفتہ بنا دیا تھا۔ وہ آپؐ کے ہر قول کو سرمۂ چشم بنا لینے میں سعادت محسوس کرتے تھے۔ جب مشرکین نے حضرت زیدؓ بن دثنہ کو قتل کرنے کے لیے تیاری مکمل کر لی تو ابوسفیان نے زید بن دثنہ سے پوچھا۔ "اے زید، خدا کو گواہ بنا کر بتاؤ کیا تم یہ پسند کرو گے کہ آج تمھاری بجائے ہمارے پاس محمدؐ ہوتے تاکہ ان کا سر قلم کر دیا جاتا اور تم کو ہم چھوڑ دیتے اور تم اپنے بال بچوں میں ہوتے۔" حضرت زیدؓ نے کہا:

"خدا کی قسم میں تو یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ محمدؐ اس وقت جہاں ہیں وہیں اُن کے پیر میں کانٹا چبھو کر مجھے رہا کر دیا جائے تاکہ میں اپنے اہل و عیال میں بیٹھوں۔"

یہ سن کر ابوسفیان پکار اُٹھا:

مَا رَأَیْتُ اَحَدًا مِّنَ النَّاسِ یُحِبُّ اَحَدًا کَحُبِّ اَصْحَابِ مُحَمَّدٍ مُحَمَّدًا (بیہقی)

میں نے کسی آدمی کو کسی سے اتنی محبت کرتے ہوئے نہیں دیکھا جتنی محبت محمدؐ سے ان کے اصحاب کرتے ہیں۔

حضورؐ کے حُسنِ کردار کو دیکھتے ہوئے آپؐ کی ذاتِ گرامی اپنے رفقاء کے درمیان کتنی محبوب تھی اس کا اندازہ بآسانی اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب ایک انصاری عورت کو یکے بعد دیگرے اس کے باپ، بھائی اور شوہر کے جنگ احد میں شہید ہونے کی خبر دی گئی تو اس نے کہا مجھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حال بتاؤ۔ لوگوں نے کہا 'وہ خیریت سے ہیں۔ اس نے کہا چلو' مجھے دکھاؤ، میں اپنی آنکھوں سے آپؐ کو دیکھنا چاہتی ہوں جب اس انصاری عورت نے آپؐ کو بخیریت دیکھا تو پکار اٹھی۔

کُلُّ مُصِیْبَۃٍ بَعْدَکَ جَلَلٌ (بیہقی) "آپؐ کی سلامتی کے بعد ہر مصیبت آسان ہے"

مختصر یہ کہ جب انسان کا کردار اپنی دعوت کے عین مطابق ہو تو لوگوں کو اس سے والہانہ محبت ہو جاتی ہے اور یہی محبت کردار سازی کا عظیم فریضہ انجام دیتی ہے۔

آج بھی دعوت و تبلیغ اور اصلاح و تربیت کا کام کرنے والے افراد اور جماعتیں اگر اپنا کردار اپنی دعوت کے عین مطابق بنالیں تو ان کے پیروکار ان کے کردار سے متاثر ہو کر خود اپنی سیرتوں کو پاکیزہ اور معیاری بنالیں گے۔ آج دنیا پھر کسی ایسے شخص کے انتظار میں ہے جو قول و فعل کی یکسانیت کا بہترین نمونہ ہو۔ جو اخلاق و کردار کا ایسا صاف و شفاف چشمہ ہو جس میں بے کردار لوگ بھی غوطہ زن ہو کر کردار کی عظمتوں کے حامل بن جائیں۔

نمونہ سازی

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہر شخص کے لیے بہترین نمونہ تھی۔ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ صحابہ کرامؓ کی سیرتوں کی تعمیر میں سب سے اہم اور مؤثر رول نبی کریمؐ کی عملی زندگی نے ادا کیا۔ آپؐ ہر معاملہ میں قابلِ رشک اور لائقِ اتباع نمونہ تھے۔ کسی بھی مرحلہ میں آپ کے یہاں تضاد نہیں ملتا۔ آپؐ جو کہتے وہ کرتے اور جو کرتے وہ کہتے۔ یہی وہ اعلیٰ ترین کردار تھا جس نے ہزاروں کرداروں کو وجود بخشا۔ نبی کریمؐ جہاں خود بہترین نمونہ تھے وہیں آپ کی یہ بھی کوشش رہتی کہ آپؐ کے اصحابؓ بھی دوسروں کے لیے بہترین نمونہ بنیں۔ اس سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ اصلاح وتربیت کے سلسلے میں انسان جہاں دوسروں کے لیے خود بہترین نمونہ ہو، وہیں یہ بھی اس کی ذمہ داری ہے کہ اپنے زیرِ تربیت افراد کو وہ دوسروں کے لیے بہترین نمونہ بنانے کی فکر اور کوشش کرے۔

نعمان بن بشیرؓ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ میرے والد مجھے لے کر رسولِ اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور میرے والد نے میری طرف اشارہ کرکے عرض کیا "اے اللہ کے رسولؐ! میرے پاس جو غلام تھا وہ میں نے اپنے اس بیٹے کو دے دیا ہے۔" رسول اللہؐ نے دریافت فرمایا "کیا تم نے اپنے تمام لڑکوں کو غلام عطا کیے ہیں؟" میرے والد نے کہا: "نہیں!" اس پر آنحضورؐ نے فرمایا "اللہ سے ڈرو اور اولاد کے سلسلہ میں عدل و انصاف اختیار کرو۔" (بخاری ومسلم)

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہؐ کے پاس ایک شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس دوران اس کا ایک بیٹا آیا۔ اس شخص نے اپنے بیٹے کا بوسہ لیا اور اسے اپنی ران پر بٹھا لیا۔ پھر اس کی لڑکی آئی اور اس نے لڑکی کو اپنے سامنے بٹھا لیا۔ یہ دیکھ کر آنحضورؐ نے اس کو

مخاطب کر کے فرمایا:

"تو نے ان دونوں کے ساتھ انصاف و برابری کا برتاؤ کیوں نہیں کیا؟" (بخاری)

ان واقعات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریمؐ والدین کو دو ہدایات دینا چاہتے تھے۔ ایک یہ کہ اولاد کے درمیان عدل و مساوات کی روش اختیار کرنا چاہیئے ان کے درمیان نابرابری کا سلوک ظلم ہے۔ دوسرے یہ کہ انھیں اپنی اولاد کے لیے عدل و انصاف، مساوات و برابری کا بہترین نمونہ بننا چاہیئے تاکہ وہ اپنی اولاد کے حقوق کی ادائیگی کے ساتھ ان کی تربیت کا بھی ذریعہ بن سکیں۔

سہل بن سعدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ کے پاس ایک مشروب لایا گیا اس وقت مجلس میں کچھ دوسرے لوگ بھی موجود تھے۔ دائیں جانب ایک لڑکا تھا اور بائیں جانب کچھ معمر لوگ تھے تو آپؐ نے دائیں جانب بیٹھے ہوئے لڑکے سے کہا کہ کیا مجھے یہ اجازت دے سکتے ہو کہ میں پہلے ان شیوخ کو پلا دوں۔ (بخاری و مسلم)

ذرا رک کر اسی واقعہ پر غور کیجیے۔ اگر آنحضورؐ چاہتے تو حسب معمول دائیں جانب سے شروع کر دیتے۔ اس پر کسی کو اعتراض نہ ہوتا اور اگر آپ چاہتے تو شیوخ کا لحاظ کرتے ہوئے پہلے انھیں پیالہ دیتے اور اس پر بچہ کو کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ کیوں کہ لڑکے کے مقابلے میں بہر حال شیوخ قابل ترجیح ہیں اور دائیں جانب سے شروع کرنا فرض یا واجب نہیں بلکہ صرف مستحب ہے مگر یہاں پر آنحضورؐ حاضرین کو دوسروں کے لیے نمونہ اور اس بچے کی تعلیم دے رہے ہیں۔ شیوخ کو یہ تعلیم دینا چاہتے ہیں کہ اپنے سے کم عمر لوگوں سے اگر واسطہ پڑے تو انھیں اپنے سے چھوٹا سمجھ کر نظر انداز نہ کر دینا اور اس لڑکے کو یہ تعلیم دینا چاہتے ہیں کہ جب بزرگوں سے واسطہ پیش آئے تو استحقاق کے باوجود انھیں اپنے اوپر ترجیح دے کر اچھا نمونہ بننا۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک اعرابی رسول اللہؐ کے پاس آیا اور اس نے عرض کیا "آپ لوگ بچوں کو چومتے ہیں۔ ہم تو ان کو نہیں چومتے" یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ....

أَوَ أَمْلِكُ إِنْ نَزَعَ اللّٰهُ الرَّحْمَةَ مِنْ قَلْبِكَ ۔ (متفق علیہ)

اگر خدا تمھارے دل سے محبت نکال دے تو میرا کیا بس ہے ؟

حضرت عائشہؓ ایک دوسری روایت میں بیان کرتی ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کے دونوں بیٹوں حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کو چوما۔ اس وقت اَقرَعْ بن حَابِسؓ وہاں موجود تھے انھوں نے آنحضرتؐ سے کہا، "میرے دس بیٹے ہیں، لیکن میں نے تو کبھی کسی کو نہیں چوما۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اَقرَعْ بن حَابِسؓ کو دیکھا اور کہا :

مَنْ لَّا يَرْحَمُ لَا يُرْحَمُ (بخاری ومسلم)

جو شخص رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔

یہ دونوں احادیث ایک طرف بچوں کے ساتھ شفقت کرنے کی تلقین کرتی ہیں تو دوسری طرف واضح طور پر یہ اشارہ بھی کرتی ہیں کہ آپؐ یہ چاہتے تھے کہ لوگ اپنے بچوں کے ساتھ محبت وشفقت کا برتاؤ کر کے ان کے لیے بہتر نمونہ بنیں تاکہ ان کی اولاد ان کے نقشِ قدم پر چل سکے

مُربّی کے اوصاف

تعلیم و تربیت اور اصلاح و تعمیر کے سلسلہ میں معلّمین و مُربّین کا چند اوصاف سے متصف ہونا ضروری ہے، ورنہ تعلیم و تربیت کے تمام ذرائع و وسائل حتیٰ کہ حکیمانہ طریقے بھی سود مند اور مؤثر نہیں ہو سکتے ہیں۔ ذیل میں ایسے ہی چند اوصاف کی جانب نشاندہی کی جا رہی ہے۔

اخلاص

اخلاص ایک بنیادی وصف ہے جس کے بغیر کوئی بھی عمل نتیجہ خیز نہیں ہو سکتا۔ کوئی کام کتنی ہی خوب صورتی سے کیا جائے اگر اس میں اخلاص کی روح کارفرما نہ ہو تو ملمع سازی کی چمک دمک بہت جلد اپنا اثر کھو دیتی ہے۔ مُربّی کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ تربیت و اصلاح کے سلسلہ میں صرف خدا کی رضا کو پیش نظر رکھے۔ نہ اپنی کسی منفعت کا حصول اس کے سامنے ہو، نہ کسی مادی غرض کی تکمیل، بلکہ ہر معاملہ میں وہ خدا کی خوشنودی کے حصول کے جذبہ سے سرشار ہو۔ وہ تربیت کے لیے کوئی بھی قدم اٹھائے اس میں خلوص و للّٰہیت کی جھلک نظر آنی چاہیے۔ وہ نصیحت و موعظت کرے یا زجر و توبیخ سے کام لے، اس کا لہجہ نرم ہو یا سخت، وہ پیار و محبت سے بھی سمجھائے یا سختی سے تنبیہہ کرے، ہر عمل اور اقدام میں اخلاص کی کارفرمائی ضروری ہے۔ بغیر اخلاص و للّٰہیت کے جو کام بھی کیا جاتا ہے اگرچہ بظاہر وہ اچھا معلوم ہوتا ہے مگر نتائج کے اعتبار سے مؤثر نہیں ہوتا۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بہت سے لوگ اپنے بچوں یا اپنے زیرِ اثر افراد کی تربیت کے سلسلہ میں بہت سی تدابیر اختیار کرتے ہیں، تمام نفسیاتی پہلوؤں کا خیال رکھتے ہیں، بہت سے حکیمانہ طریقے استعمال کرتے ہیں مگر ان کی کاوشوں کے نتائج ان کے اندازہ کے بالکل برعکس نکلتے ہیں۔ اس طرح کے واقعات کے اثرات و

نتائج پر اگر آپ گہرائی سے غور کریں تو اسی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ تربیت کرتے وقت مربین کے یہاں اخلاص کا فقدان رہا ہے۔ اسی حقیقت کی جانب نبیؐ کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں توجہ دلائی ہے:

إِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ لَا يَقْبَلُ مِنَ الْعَمَلِ إِلَّا مَا كَانَ لَهُ خَالِصًا وَّابْتُغِيَ بِهٖ وَجْهُهٗ۔ (ابوداؤد)	اللہ تعالیٰ صرف اس عمل کو قبول کرتا ہے جو اس کے لیے مخلصانہ طور پر کیا گیا ہو اور اس سے اس کی رضا مقصود ہو!

تربیت و اصلاح کے فرائض انجام دیتے ہوئے یہ بات کسی وقت بھی ذہن میں نہ آنی چاہیے کہ میں مربی ہوں اور فلاں شخص کی میں تربیت کر رہا ہوں، اس سے کبر و غرور پیدا ہوتا ہے اور مربی کا اپنے زیر تربیت افراد سے جو مخلصانہ تعلق ہونا چاہیے اس میں کمی آجاتی ہے۔ اخلاص میں یہ بات بھی شامل ہے کہ انسان دوسروں کی تربیت کرتے ہوئے اپنی ذات سے غافل نہ رہے۔ اپنے کو دوسروں سے بالاتر نہ سمجھے۔ اپنے بارے میں کبھی اس واہمہ کا شکار نہ ہو کہ میری تربیت تو ہو چکی ہے اور اب میں دوسروں کی تربیت کرنے کے منصب پر فائز ہوں۔ یہ اندازِ فکر اصلاح و تربیت کے بجائے بگاڑ اور فساد کا سبب بن جاتا ہے۔

خدا کے لیے مخلص ہونے کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اپنے زیر تربیت افراد کے لیے بھی انسان مخلص ہو، ان سے دلی محبت و ہمدردی ہو، اسے ان کی نجات کی فکر ہر وقت دامن گیر ہو۔ یہ خیر خواہی اس درجہ اور اتنی واضح ہو کہ اس کے مخاطبین اس کی ہر بات اور نصیحت کو خواہ وہ کتنے ہی سخت لب و لہجہ میں کہی جائے، اپنے لیے باعث خیر سمجھیں اور انھیں یہ یقین کامل ہو کہ ان کو نصیحت و فہمائش کرنے والا شخص ان کا خیر خواہ ہے۔ نبیؐ کریمؐ اپنے اصحابؓ کے لیے اس قدر مخلص اور خیر خواہ تھے کہ ہر صحابی یہ سمجھتا تھا کہ اللہ کے رسولؐ مجھ سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں، نہ صرف اپنے اصحاب اور اہل ایمان کی اصلاح و تربیت کی فکر آپؐ کو ہر وقت دامن گیر رہتی تھی بلکہ آپ اپنے دشمنوں کی ہدایت کے لیے بھی بے چین رہتے تھے۔ قرآن پاک اس بات پر گواہی دیتا ہے:

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ٥ (الکہف: ٦)

اے نبیؐ، شاید تم ان کے پیچھے غم کے مارے اپنی جان کھودینے والے ہو اگر یہ اس تعلیم پر ایمان نہ لائے۔

نبیؐ کریمؐ لوگوں کی ہدایت اور اصلاح و تربیت کے لیے کس قدر بے چین رہتے تھے اس کا اندازہ درج ذیل حدیث سے لگایا جا سکتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

"میری مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص نے آگ روشن کی۔ جب آگ نے اپنے گردو پیش کو خوب روشن کر دیا تو پروانے اور یہ کیڑے جو آگ میں گرا کرتے ہیں اس (آگ) میں گرنے لگے اور وہ شخص انھیں روک رہا ہے اور وہ ہیں کہ اس پر غالب آکر اس میں گھسے پڑتے ہیں تو میری اور اپنی مثال ایسی ہی سمجھو کہ میں تمھیں آگ سے روکتا ہوں اور تم ہو کہ اس میں گھسے پڑتے ہو۔ (بخاری)

اصلاح و تربیت کے فرائض انجام دیتے ہوئے جہاں انسان خدا کے لیے مخلص ہو، وہیں پر وہ اپنے مخاطبین کے لیے سرتاسر نصح و خیرخواہی بن جائے۔ اس کا ہر قول اور ہر عمل درد و سوز میں ڈوبا ہوا ہو۔ ریاکاری، تصنع اور نفاق جیسے عیوب کا ذرا بھی شائبہ نہ ہو!

علم

اصلاح و تربیت کرنے والوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ علم کی دولت سے مالا مال ہوں۔ انھیں دینِ اسلام کے احکام اور اوامر و نواہی کا اتنا علم ضرور ہو کہ ہر مرحلہ پر صحیح رہنمائی کر سکیں۔ وہ قرآن و حدیث کا گہرا مطالعہ رکھتے ہوں تاکہ اسلام کی سچی نمائندگی کر سکیں۔ اسوۂ رسولؐ اور اسوۂ صحابہؓ سے واقفیت ہو تاکہ ان کی زندگی کی روشنی میں اپنے فرائض کی ادائیگی کر سکیں۔ وہ نئے ابھرتے حالات اور نئے تقاضوں سے بھی واقف ہوں تاکہ جدید رجحانات کے پس منظر میں اپنے مخاطبین کے جذبات و نفسیات کا خیال رکھتے ہوئے توازن و اعتدال کے ساتھ ان کی تربیت کی ذمہ داریوں کو ادا کر سکیں۔

اگر انسان کو ضروری علم حاصل نہ ہو تو وہ اصلاح و تربیت جیسے نازک اور اہم فرض کی ادائیگی نہیں کر سکتا، وہ نفسیاتی پیچیدگیوں اور جذباتی نزاکتوں کو نہیں سمجھ سکتا جس کی وجہ سے مخاطبین کے بھٹکنے اور گمراہ ہو جانے کا پورا اندیشہ رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے حصولِ علم پر بڑا زور دیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ (ابن ماجہ) علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔

چونکہ مسلم معاشرہ کا ہر فرد کسی نہ کسی کا نگراں اور مربی ہوتا ہے اس لیے ہر فرد کے لیے علم حاصل کرنا ضروری قرار دیا تاکہ مسلم معاشرہ کے تمام افراد ضروری علمِ دین حاصل کر کے اپنے فرائض کو ادا کر سکیں۔

نئی نسل کی تربیت کی ذمہ داری جن حضرات پر عائد ہوتی ہے ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ علم حاصل کریں۔ تربیت کے قواعد اور حکیمانہ اصول کا مطالعہ کریں۔ یہ جانکاری حاصل کریں کہ مُربّی کے لیے کن اوصاف کا اختیار کرنا ضروری ہے اور کن امور سے اجتناب لازمی ہے اسی کے ساتھ حالات و جذبات اور مزاج و نفسیات کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کریں اگر ممکن ہو تو تعلیم و تربیت کے موضوع پر جو علمی کام ہوا ہے اس کا بھی مطالعہ کریں تاکہ جدید نظریات و تجربات کا صالح مواد لے کر اس سے بھی فائدہ حاصل کیا جا سکے۔

صبر و تحمل

مُربّی کا ایک بنیادی وصف صبر و تحمل بھی ہے۔ اس کے بغیر کوئی شخص بھی تربیت جیسے نازک فریضہ کی ادائیگی نہیں کر سکتا۔ اصلاح اور تربیت کا عظیم کام کرنے والوں کو اپنے اندر بے پناہ صبر و تحمل کی اسپرٹ پیدا کرنا چاہیے۔ میں نے جب غور کیا کہ جن انبیاء کا قرآن میں تذکرہ کیا گیا ہے ان میں سے بیشتر نے بکریاں چرائی ہیں خود مُربّی اعظم ؐ سے مشیت ایزدی نے بکری چرانے کا کام لیا ہے تو میری سمجھ میں یہ حکمت آئی ۔۔۔ کہ بکری ایک بہت کمزور جانور ہے اگر اس کے ایک ڈنڈا زور سے مار دیا جائے تو اس کا زندہ رہنا مشکل ہے اس کے ساتھ ساتھ جب اسے کھلا چھوڑ دیا جائے تو وہ اِدھر اُدھر بہت زیادہ بھٹکتی ہے ان دونوں حقیقتوں کو سامنے رکھتے ہوئے بکریوں کے ریوڑ کے بارے میں سوچیے۔ جب بہت سی بکریاں ایک ساتھ ہوں تو ان میں سے کوئی اِدھر بھاگ رہی ہوگی اور کوئی اُدھر۔ جب ایک بکری ریوڑ سے الگ ہو کر ایک طرف کو بھاگتی ہے تو چرواہا غصہ میں لاٹھی لیے اس کے پیچھے بھاگتا ہے مگر جیسے ہی وہ لاٹھی رسید کرنا چاہتا ہے یہ تصور اس کے ہاتھوں کو روک دیتا ہے کہ ایک ہی لاٹھی میں بکری کا کام تمام ہو جائے گا۔ وہ اس بکری کو آہستہ سے ریوڑ میں لاتا ہے کہ دوسری بکری ایک طرف کو کھسک لیتی ہے اور اس طرح چرواہے کو بار بار اپنے مشتعل جذبات کو قابو میں کرنا پڑتا ہے۔ یہ وہ صورت حال ہے جو چرواہے کو صبر و تحمل کا عادی بناتی ہے۔ انبیاء کو تعلیم و تربیت، اصلاح و تزکیہ کے جس بلند منصب پر فائز کیا گیا تھا۔ غالباً اس منصب کی نزاکت کے پیش نظر انھیں صبر و تحمل اور نزاکتوں کے احساس کا عادی بنانے کے لیے ان سے بکریاں چروائی گئیں۔

صبر و تحمل کا مفہوم یہ ہے کہ انسان بات بات پر غصہ نہ ہو بلکہ معمولی معمولی باتوں کو

نظر انداز کر دے اسی طرح سے صبر و تحمل کے مفہوم میں یہ بات بھی داخل ہے کہ انسان اپنے جذبات کو مشتعل نہ ہونے دے۔

وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ (آل عمران: ۱۳۴)

اور جو غصہ کو پی جاتے ہیں اور دوسروں کے قصور معاف کر دیتے ہیں ایسے نیک لوگ اللہ کو بہت پسند ہیں۔

اسی طرح آدمی جلد بازی نہ کرے بلکہ ہر کام کو سکون اور ٹھہراؤ کے ساتھ انجام دے۔ اسی طرح اگر اس کی کاوشوں کے نتائج فوراً ظاہر نہ ہوں تو قلق و اضطراب کا اظہار نہ کرے اور نہ ہی قنوط و مایوسی کا شکار ہو، بلکہ ڈھارس باندھے رکھے اور مسلسل محنت کرتا رہے۔ دیکھا گیا ہے کہ بہت سے لوگ جب دوسروں کی تربیت کرتے ہیں اور ان میں کوئی تبدیلی نہیں دیکھتے تو بددل ہو کر ان کی تربیت کرنا چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ تربیت کے نتائج بہت دیر سے ظاہر ہوتے ہیں اس لیے اس سلسلہ میں جلد بازی کرنا اور فوری نتائج کی امید رکھنا صحیح نہیں ہے۔ بری عادتیں آہستہ آہستہ چھوٹتی ہیں اور اچھی عادتیں تدریجاً پروان چڑھتی ہیں۔ اس لیے مایوسی کا شکار کبھی نہ ہوئیے بلکہ صبر و تحمل سے کام لیجیے۔

وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذَالِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ (الشوریٰ: ۴۳)

جو شخص صبر سے کام لے اور درگذر کرے تو یہ بڑی اولوالعزمی کے کاموں میں سے ہے۔

تربیت ایک صبر آزما کام ہے اس اہم فریضہ کو ادا کرتے ہوئے انسان کو بلند ہمتی سے کام لینا چاہیے۔ دوام و تسلسل کے ساتھ اپنی کوشش کو جاری رکھنا چاہیے، مشتعل ہو کر کوئی غلط قدم نہیں اٹھانا چاہیے۔ اپنے مزاج کے خلاف باتوں کو برداشت کرنا چاہیے، مسلسل ناکامیوں کے باوجود بھی ہمت نہیں ہارنا چاہیے۔ تربیت کے سلسلہ میں بڑے سخت مراحل آتے ہیں ان سخت مراحل میں اپنے کو قابو میں رکھنا اصل بہادری ہے۔

لَيْسَ الشَّدِيدُ بِالصُّرَعَةِ إِنَّمَا الشَّدِيدُ الَّذِي يَمْلِكُ نَفْسَهُ عِنْدَ الْغَضَبِ (متفق علیہ)

کشتی میں پچھاڑنے والا طاقتور نہیں ہے اصل طاقتور وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے آپ کو قابو میں رکھے۔

ہر مربی کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے زیرِ تربیت افراد کی خوبیاں اور کمیاں نہایت باریک بینی سے نوٹ کرے۔ خوبیوں پر ہمت افزائی کرتے ہوئے انھیں پروان چڑھائے اور کمیوں کو دور کرنے کے لیے حکمت و تدبر کے ساتھ کوشاں رہے۔ اگر کسی خامی یا کمی پر قابو پانے میں اسے دشواری محسوس ہو تو بد دل یا مایوس نہ ہو بلکہ عزم و حوصلہ کے ساتھ اپنی کوشش جاری رکھے۔

تربیت ایک بڑی صبر آزما ذمہ داری ہے۔ اس لیے ہر مربی کو صبر و عزیمت کا پہاڑ بن کر تربیت کے فرائض انجام دینا چاہییں۔ جلدبازی یا مایوسی غلط اثرات و نتائج کا موجب ہو سکتی ہے۔

نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ مبارکہ کو سامنے رکھیے کہ آپؐ نے کن شدید اور پُرخطر حالات میں صحابہؓ کی تربیت کے فرائض انجام دیئے۔ آپؐ سخت سے سخت حالات میں بھی کسی مایوسی کا شکار ہوئے اور نہ ہی جلدبازی کا مظاہرہ کیا۔

حسن گفتار

انسان کی زبان، لب و لہجہ، اندازِ تخاطب و طرزِ گفتگو کا اثر بہت زیادہ اس کے مخاطبین پر پڑتا ہے. اگر آواز شیریں، خوش گوار اور میٹھی ہو تو مخاطبین پر کوئی اکتاہٹ طاری نہیں ہوتی اور وہ دل کی گہرائی سے اس کا اثر قبول کرتے ہیں. لیکن، آواز اگر کرخت، بھدی، چیخ والی ہو تو مخاطبین کے کانوں پر گراں گزرتا ہے؛ ان کے ذوقِ سماعت پر بار محسوس ہوتا ہے اور پھر مخاطبین ایسے شخص کی باتوں سے نہ صرف یہ کہ کوئی اثر نہیں لیتے بلکہ اس کی باتوں سے متنفر ہونے لگتے ہیں۔ مُربیٔ اعظم ﷺ کی آواز نہ بہت بلند ہوتی تھی نہ پست بلکہ درمیانی ہوتی تھی اور اس قدر شیریں کہ سننے والا بغیر اثر لیے نہ رہتا تھا اُمِ معبدؓ نے کس قدر جامع الفاظ میں آپ کے طرزِ تکلم کو بیان کیا ہے:

"الفاظ نہ ضرورت سے زیادہ نہ ضرورت سے کم ـــ نہ کوتاہ سخن نہ طویل گو"
(شمائل ترمذی)

فضول باتوں اور لایعنی گفتگو سے اجتناب کیجیے. بغیر ضرورت گفتگو کرنے سے انسانی شخصیت مجروح ہوتی ہے اور اس کی بہت سی کمزوریاں ظاہر ہوتی ہیں، بہت سے مسائل خواہ مخواہ پیدا ہو جاتے ہیں۔ طویل گفتگو سے مخاطب اُکتا جاتا ہے اور اصل مدعا کو محفوظ رکھنا اس کے لیے مشکل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ضرورت سے کم گفتگو کرنے پر مخاطب مدعا کو نہیں سمجھ پاتا نہ ہی وہ مطمئن ہو پاتا ہے. تعلیم و تربیت، دعوت و تبلیغ کے سلسلہ میں انسان کو گفتگو بہتر سے بہتر ڈھنگ سے کرنی چاہیئے۔ ایک طرف طوالت سے اجتناب کرنا چاہیئے، دوسری طرف گونگے بن کر نہیں رہنا چاہیئے بلکہ حسب

ضرورت گفتگو کرنا چاہیے۔ آیئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حسنِ گفتار کا مطالعہ کر کے اس کو اختیار کرنے کی کوشش کریں۔

"آپؐ بلا ضرورت گفتگو نہ فرماتے، ابتدا سے انتہا تک آپ منہ بھر کر بولتے رہے نہیں کہ آدھی بات اندر ہی رہ جائے) آپ کی بات فیصلہ کن ہوا کرتی تھی۔ اہل مجلس کی گفتگو میں غیر متعلق موضوع نہ چھیڑتے بلکہ جو سلسلۂ کلام چل رہا ہوتا اسی میں شریک ہو جاتے۔ اگر کسی موضوع سے صحابہ کو اکتایا ہوا محسوس کرتے تو اس کو بدل دیتے، گفتگو کے دوران ہر فردِ مجلس پر توجہ فرماتے تاکہ کوئی یہ محسوس نہ کر سکے کہ آپ نے اس پر کسی دوسرے کو فوقیت دی ہے۔ گفتگو کرنے والے کی جانب سے اس وقت تک منہ نہ پھیرتے جب تک وہ خود منہ نہ پھیر لیتا۔ کسی کی بات کو کبھی نہ کاٹتے۔ الا یہ کہ کوئی بات خلافِ حق ہو۔ کھڑے کھڑے کسی اہم موضوع پر گفتگو کرنے کو ناپسند فرماتے۔ گفتگو کے دوران صحابہؓ کے ساتھ ہنستے بھی اور دلچسپی کا اظہار بھی فرماتے۔ آپ نہ کسی کی برائی میں زبان کھولتے، نہ عیب چینی کرتے اور نہ کسی کے راز کو جاننے کی کوشش کرتے۔ جب کسی کی طرف متوجہ ہوتے تو پوری طرح متوجہ ہوتے۔ زبان پر کوئی گندی بات نہ لاتے، نہ چیخ کر بولتے۔ لایعنی باتوں سے پرہیز کرتے اور دوسروں کو بھی روکتے۔ کلام سے پہلے سلام کا اہتمام فرماتے۔ آپؐ کی آواز میں حسبِ ضرورت اُتار چڑھاؤ ہوتا۔ گفتگو میں کسی طرح کا کوئی تصنع اور تکلف نہ ہوتا بلکہ سادگی اور بےساختگی ہوتی۔ گفتگو میں تبسم کی آمیزش رہتی تھی۔ گفتگو کے دوران کسی بات پر زور دینا ہوتا تو ٹیک سے اٹھ کر سیدھے ہو بیٹھتے۔ خاص باتوں کو بار بار دہراتے۔ حاضرین کو کسی بات سے ڈراتے تو زمین پر ہاتھ مارتے، اپنی بات کی وضاحت کے لیے ہاتھوں اور انگلیوں کے اشاروں سے مدد لیتے۔ تعجب کے موقعوں پر ہتھیلی کو الٹ دیتے، کبھی سر ہلاتے، اور ہونٹوں کو دانتوں سے دباتے، کبھی ران پر ہاتھ مارتے۔" ؎۱

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرزِ تکلم کو سامنے رکھتے ہوئے ہر مسلمان کو کوشش کرنا چاہیے کہ وہ آپ کی پیروی میں حسنِ گفتار کی صفت سے متصف ہو سکے۔ ذرا غور کیجیے۔

؎۱ حاشیہ اگلے صفحہ پر

نبوت کا بھاری بوجھ اٹھائے ہوئے، مسائل کے حصار میں گھرے ہوئے، طرح طرح کی اذیتوں اور پریشانیوں کا مقابلہ کرتے ہوئے آپؐ کی گفتگو میں کس قدر اعتدال، دلکشی پائی جاتی تھی کہ آپ کی باتیں جادو کی طرح اثر کرتی تھیں ورنہ پے بہ پے مشکلات و مصائب انسان کے لب و لہجہ میں کرختگی اور چڑچڑاپن پیدا کر دیتی ہیں لیکن رسول خدا ایک عالمی تحریک کے فونڈ، ایک سلطنت کے حکمران، ایک معاشرہ کے معمار، فوج کے سپہ سالار اور ایک خاندان کے قوام تھے، کس قدر مسائل میں گھری ہوئی تھی آپ کی ذات گرامی، مگر گفتگو میں تبسم و مسکراہٹ کی حلاوت گھلی ہوئی ہوتی، اور ہر موضوع پر بلا تکلف گفتگو فرماتے۔ حضرت زید بن ثابتؓ فرماتے ہیں:

"جب ہم دنیوی امور کے بارے میں گفتگو کرتے تو حضورؐ بھی اس میں حصہ لیتے جب ہم آخرت پر گفتگو کرتے تو حضورؐ بھی اس موضوع پر تکلم فرماتے اور جب ہم کھانے پینے کی کوئی بات چھیڑتے تو حضورؐ بھی اس میں شامل رہتے۔" (شمائل ترمذی)

واقعہ یہ ہے کہ جب ایک تحریک کے لیے ماحول سے کشمکش جاری ہوتی ہے، سچے جذبات کی موجیں اٹھتی ہیں تو پھر ہر بات میں مقصد کی لگن معنویت پیدا کر دیتی ہے۔ جذبات کا خلوص ہر بول کو ادبی چاشنی عطا کر دیتا ہے اور کردار کی عظمت ہر لفظ کو اثر آفریں بنا دیتی ہے۔

ہمیں اپنے مشن کو کامیاب بنانے کے لیے حضور اکرمؐ کے طرز تکلم کی خصوصیات کو اپنانا ضروری ہے تاکہ پاکیزہ پیغام پاکیزہ زبان میں لوگوں تک پہنچایا جا سکے۔

ؔ شمائل ترمذی کے باب "کیف کان کلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" کو سامنے رکھ کر ترتیب دیا گیا ہے۔

حسنِ کردار

مُربی کے لیے سب سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ وہ دوسروں کی تربیت سے پہلے اپنی تربیت کرے، دوسروں کو اچھائی کا عادی بنانے سے پہلے خود

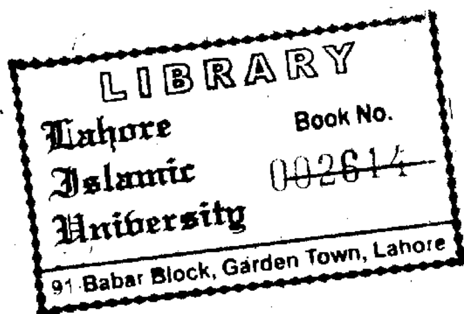
اچھائیوں کا عادی بن جائے۔ دوسروں کو بُری عادتوں سے چھٹکارا دلانے سے پہلے خود بُری عادتوں سے کنارہ کش ہوجائے۔ انسان کا اپنا کردار دوسروں کے لیے وجہ کشش ہوتا ہے اوران پر ایک گہرا اثر ڈالتا ہے۔ کردار ایک خاموش مبلغ یا مُربی کی حیثیت رکھتا ہے ــــ مُربیِ اعظم نے اپنے اصحاب کی جو مثالی تربیت کی تھی اس میں سب سے اہم رول آپؐ کے حسن کردار نے ادا کیا تھا۔

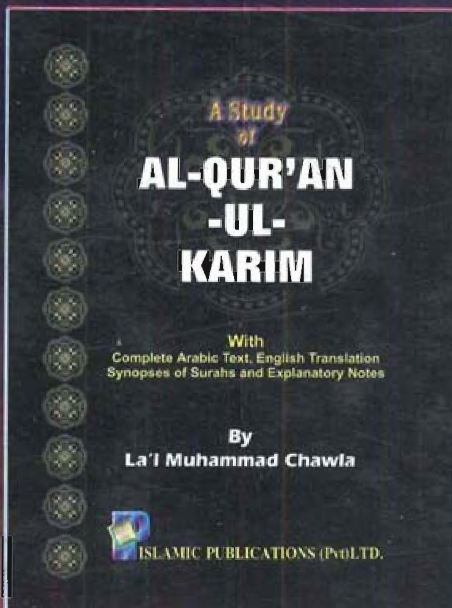
مُربی کے قول وفعل میں اگر تضاد ہو تو اس کی تمام کوششیں رائیگاں جاتی ہیں۔ لیکن اگر مُربی کے قول وفعل میں یکسانیت ہو، وہ کردار کی عظمت لیے ہوئے ہو تو اس کی معمولی کوشش بھی بڑے بڑے نتائج ظاہر کرتی ہے۔ غور کیجیے رسولِ خدا ظلمت کدۂ عالم میں تن تنہا دعوت و تبلیغ اور اصلاح وتربیت کے کام کا آغاز کرتے ہیں اور ۲۳ سال کی قلیل مدت میں پورا عرب مفتوح ہوجاتا ہے اور عجم میں آپ کے چرچے ہونے لگتے ہیں۔ اس انقلاب کو یہ ہمہ گیری کس چیز نے عطا کی ـــــ آپؐ کے حسنِ کردار اور متقیانہ زندگی نے آپؐ کا حسن کردار سب سے بڑا مبلغ اور داعی تھا۔ آپؐ کی بلند کرداری سب سے بڑی با اثر اپیل اور سب سے محکم دلیل تھی جس کا کوئی توڑ کسی کے پاس نہ تھا۔ لوگ آپؐ کے حسن کردار سے متاثر ہوتے اور اپنے کو اسلامی انقلاب کے حوالہ کردیتے۔ لوگ آپؐ کا خاتمہ کرنے کے لیے آتے مگر آپؐ کے کردار سے متاثر ہو کر آپ کے حلقہ میں شامل ہوجاتے، تعاقب کرنے والے آپؐ سے امان نامہ لکھواتے، آپؐ پر تلوار اٹھانے والے آپؐ کا دفاع

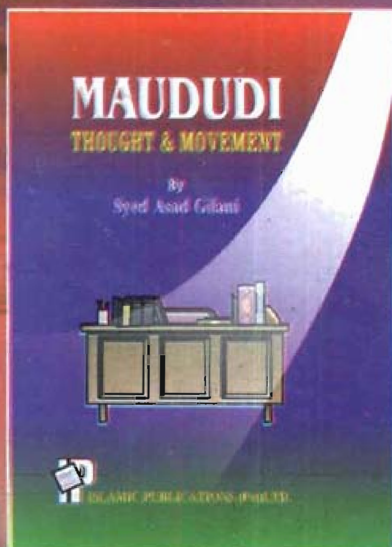
کرنے والوں میں شامل ہو جاتے۔ زانی و بدکار آپ کی بلند کرداری سے متاثر ہو کر عفت و حیا کا پیکر بن جاتے۔ فساد اور قتل و غارت گری کے عادی انسانیت کے محافظ بن جاتے جب آپ کے دشمن دیکھتے کہ گالی سن کر آپ دعائیں دے رہے ہیں، پتھر کھا کر آپ پھول برسا رہے ہیں اور اذیتیں سہہ کر ان کے حق میں کلمات خیر کہہ رہے ہیں تو وہ آپ کے کردار سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے تھے۔

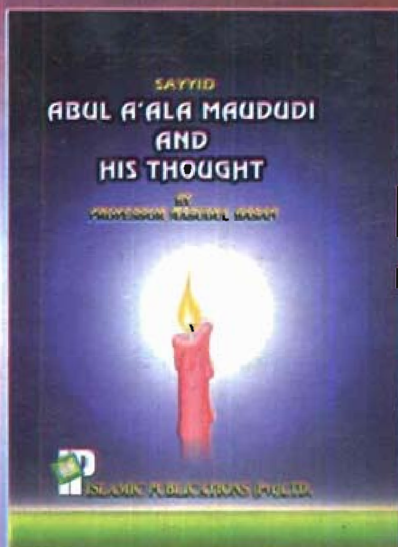
اصلاح و تربیت کا کام کرنے والوں کی اولین ذمہ داری ہے کہ وہ تقویٰ اور خدا ترسی کی زندگی گذاریں۔ فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی اور محرمات سے مکمل اجتناب کریں، خدا کے حقوق کے ساتھ ساتھ بندوں کے حقوق بھی ادا کریں۔ اسلامی آداب و عادات کو اختیار کریں، پوری زندگی ایک صالح بندہ کی حیثیت سے گذاریں، تو ان کی کوششیں یقیناً بارآور ہوں گی ورنہ حسرت و ناکامی کے سوا کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔

اللہ سے دعا ہے کہ وہ اپنے رسول کے طریق تربیت کی روشنی میں ہمیں اپنی اور اپنے متعلقین کی تربیت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اس سلسلہ میں ہماری کوتاہیوں کو نظر انداز فرمائے، اور ہماری حقیر کوششوں کو شرف قبولیت عطا فرمائے۔ (آمین)


LIBRARY
Lahore
Islamic
University
Book No.
002614
91 Babar Block, Garden Town, Lahore







اسلامک پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

۶۔ کورٹ سٹریٹ، لوئر مال، لاہور (پاکستان) فون: 042-7248676